ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

محدِّث

لاہور پاکستان

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ

391

اکتوبر 2022

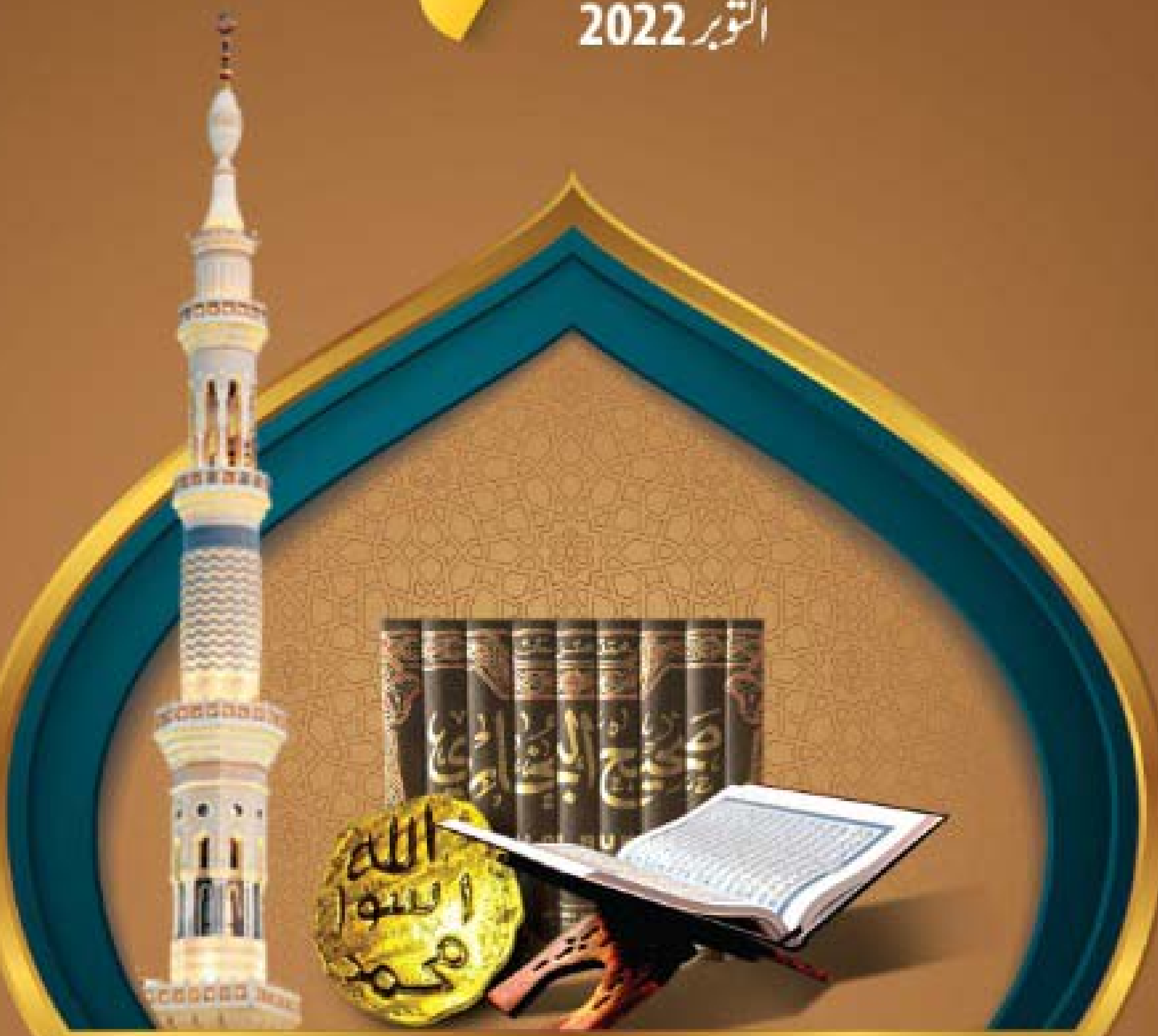

5 کیا قرآن کی کتابت رسمِ نبوی ہے؟

19 علم اختلاف الحدیث کے روشن پہلو

43 اہل سنت اور اہل تشیع کے اصول حدیث

جامعۃ لاہور الاسلامیۃ

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

مجلس التحقیق الاسلامی

ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

محدث
لاہور پاکستان

مدیر اعلیٰ
ڈاکٹر حافظ عبدالرحمن مدنی

مدیر
ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی

جلد 53 | اکتوبر 2022ء / ربیع الاول 1444ھ | عدد 01

مجلس مشاورت
▪ مولانا ارشاد الحق اثری ▪ حافظ ثناء اللہ زاہدی ▪ حافظ عبدالعزیز علوی
▪ حافظ محمد شریف ▪ حافظ مسعود عالم ▪ ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد ▪ حافظ محمد امین محمدی

فہرست مضامین

فکر و نظر — عبدالرحمن عزیز
محدث کی نصف صدی اور نیا دور — 2

الکتاب والحکمۃ — حافظ فہد اللہ مراد
قرآن کریم کا رسم الخط نبوی یا عثمانی — 5

السنۃ والحدیث — ڈاکٹر ملک کامران طاہر
علم اختلاف الحدیث کے روشن پہلو — 19

الحدیث والخبر — ابوخزیمہ علی مرتضیٰ طاہر
اہل سنت اور اہل تشیع کے اصول حدیث — 43

عقاید اہل سنت — ڈاکٹر حافظ عبدالرحمن مدنی
شرح کتاب التوحید (صحیح بخاری) — 64

اہل سنت والجماعۃ — ڈاکٹر آصف جاوید
عقائد وعمل میں اہل حدیث کے امتیازات — 78

مدیر معاون
عبدالرحمن عزیز

مینیجر
محمد اصغر 0305-4600861

زرسالانہ =/300 روپے
فی شمارہ =/60 روپے

بیرون ملک
زرسالانہ =/20 ڈالر
فی شمارہ =/4 ڈالر

Monthly Muhaddis
A/c No: 984-8
UBL-Model Town
Bank Squre Market, Lahore.

دفتر کا پتہ
99 جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700
042-35866396, 35866476
Email:
Mohaddislhr@gmail.com

Publisher:
Hafiz Abdur Rahman Madni
Printer:
Shirkat Printing Press, Lahore.

Islamic Research Council

محدث کتاب وسنت کی روشنی میں آزادانہ بحث وتحقیق کا حامی ہے، ادارہ کا مضمون نگار حضرات سے کلّی اتفاق ضروری نہیں!

فکر و نظر

محدث کی نصف صدی اور نیا دور

رسول اللہ ﷺ نے اپنے حج کے موقع پر الوداعی خطبہ دیا، جس میں پورے اسلام کا خلاصہ بیان کیا، آپ ﷺ نے خطبہ کے آغاز میں فرمایا:

''اے لوگو! میں جو کچھ کہوں اسے غور سے سنو، شائد اس کے بعد پھر کبھی یہاں ملاقات نہ ہوسکے۔''

اور خطبہ کے آخر پر فرمایا:

((فَلْيُبْلِغِ الشَّاهِدُ الغَائِبَ)). [صحيح البخاري :١٧٣٩]

''ہر موجود شخص کو چاہیے کہ (یہ باتیں) غیر حاضر تک پہنچادے۔''

یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ کی دنیا سے رخصتی کی خبر، ختم نبوت کا اعلان اور امت محمد ﷺ کی ذمہ داری کی وضاحت کرتے ہیں۔

امتِ مسلمہ نے اس ذمہ داری کو حرزِ جاں بنایا، جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیت دی تھی اسے بروئے کار لاتے ہوئے مختلف میدانوں میں اسلام کی اشاعت کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ مجاہدین نے سیف وسنان کے ذریعے اشاعت اسلام کے رستے میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کیا، تجار نے اسلام کے نظام تجارت کا عملی نمونہ پیش کیا کہ مسلمان تاجروں کے حسن معاملہ کو دیکھ کر کئی علاقے اور ملک مسلمان ہوگئے۔ علماء کرام نے کافروں تک اسلام کا پیغام پہنچانے اور مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے لیے دن رات ان تھک محنتیں کیں۔ دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تعلم کے لیے ہر طریقہ اختیار کیا، بعض نے وعظ وارشاد کے حلقے قائم کیے، بعض نے درس وتدریس کے مکاتب بنائے، بعض نے تحریر اور تصنیف وتالیف کا میدان سنبھالا اور شریعت اسلامیہ کی ایک ایک جزئی کو نکھیڑ کر امت کے سامنے پیش کیا۔ آج کوئی مسئلہ نہیں جس کے متعلق اسلاف کی کتابوں میں رہنمائی نہ ملتی ہو۔ بعد کے ادوار میں اسلاف کی کتب کی تنقیح، ترتیب، تبویب اور اختصار کرنے کے علاوہ ان کی محنتوں کو مختلف انداز میں پیش کرنے کی سعی کی جاتی رہی۔

پریس کا دور آیا تو علم کی نشر واشاعت کے کئی جدید طریقے دریافت ہوئے اور پیغام رسانی کے کئی نئے در وا ہوئے۔ ان میں سے ایک طریقہ رسائل وجرائد کا تھا، جس کے ذریعے اپنی بات لوگوں تک جلد از جلد پہنچانے

کا انتظام کیا جانے لگا۔ جن میں ماہنامہ، پندرہ روزہ، ہفتہ وار اور یومیہ بھی تھے۔ ہر تنظیم اور ہر ادارہ اپنے افکار و نظریات رسائل کے ذریعے لوگوں تک پہنچانے لگے۔ آج کوئی تنظیم ایسی نہیں جس کا نشر واشاعت کا شعبہ نہ ہو یا اس کا کوئی آرگن نہ ہو۔ برصغیر پاک وہند کی تاریخ پر رسائل کے بڑے گہرے اثرات ہیں، انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی کو فکری غذا مہیا کرنے والے البلاغ اور الہلال جیسے رسائل ہی تھے۔ تحریک پاکستان میں زمیندار اور نوائے وقت کے کردار سے کون واقف نہیں؟

صرف مثبت سوچ رکھنے والوں کی ترجمانی جرائد کے ذریعے نہیں ہورہی تھی بلکہ منفی اور سلبی سوچ رکھنے والے افراد اور جماعتوں کی پیغام رسانی کا ذریعہ بھی جرائد و رسائل ہی تھے۔

ہر رسالہ اپنے مالکان یا مدیران کی فکر و نظر کا ترجمان ہوتا ہے۔ لہذا بعض رسائل اخباری طرز کے عوامی مسائل کے متعلق مضامین شائع کرتے ہیں اور بعض خالص علمی ذوق کے حامل ہوتے ہیں، اور یہی لوگوں کے اصل رہنما ہیں۔ ایسے ہی رسائل میں ایک اہم ترین نام 'محدث' ہے۔ جو ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ کی گہری علمی سوچ اور بلند پایہ فکر کا حامل ہے۔ محدث کا پہلا شمارہ دسمبر ۱۹۷۰ء کو شائع ہوا جو اب اپنی عمر کی نصف صدی پوری کر چکا ہے۔ اس کی پیشانی پر اس کا مشن ان الفاظ میں درج ہوتا ہے:

"ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ۔"

یعنی مسلمانوں میں اصولی یا فروعی مسائل کی بنیادوں پر کھڑے ہونے والے مختلف فرقوں میں سے کسی فرقے کی ترجمانی کرنے کی بجائے بنیادی اور سلفی فکر کا ترجمان اور ملت اسلامیہ کی اجتماعیات کا آرگن ہے۔ ادارہ 'محدث' کی نظر میں عناد اور تعصب قوم کے لیے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن تعصبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم امت کے لیے رحمت کا باعث ہے، اس کا متوازن منہاج فکر ہر آخری ٹائیٹل پر طبع ہوتا ہے۔

'محدث' نے نہ صرف اپنے مقاصد اور منہاج کا پورا خیال رکھا بلکہ پاکستان کی علمی فضا پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ علماء کرام محدث کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور اس میں شائع شدہ آراء کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محدث انتظامیہ نے کبھی اپنے مقاصد سے روگردانی کی اور نہ ہی اپنے منہاج سے پہلو تہی اختیار کی۔

محترم ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ کی ادارہ جاتی مصروفیات، عالمی اسفار اور دوسری کئی وجوہات کے باعث اس کی اشاعت میں کئی نشیب و فراز آئے، لیکن قاری کی امید کبھی نہیں ٹوٹی، البتہ پچھلے دو سال سے رسالے کے ذمہ داران کی طرف سے اس کی اشاعت میں کچھ تعطل پیدا ہوا۔

ادارہ محدث کے سرپرست مولانا ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی ہیں جن کی مجلس مشاورت ان کبار علماء پر

مشتمل ہے جو عموماً ٹس ایپ گروپوں میں نہیں آتے، ان کے سامنے دورِ جدید (سیکولر معاشرہ) کے بہت اہم چیلنج ہیں کہ امتِ مسلمہ کے تمام شعبہ ہائے حیات میں ملت اسلامیہ کی مثبت دعوت بھی ملحوظ رہے اور قدیم و جدید فتنوں کی نشاندھی بھی ان کا امتیاز ہے۔ اس سلسلے میں مولانا مدنی کی مساعی دینی علمی صحافت کے علاوہ امتزاجی علوم شریعت اور عصری علوم کی حامل ایک 'مثالی یونیورسٹی' کا قیام بھی ہے، تاکہ رجال کار بھی تیار ہوتے رہیں، انہوں نے اس سلسلے میں نہ صرف اپنے مال و آل کو اس مشن پر گامزن رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ بلکہ دامے درمے سخنے ہر قسم کے وسائل اسی مشن کے لیے وقف کر رکھے ہیں۔ ان کے ساتھیوں کی ایک انجمن تھی جو اللہ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے گزر چکی ہے۔ ان سب کے بوجھ وہ اپنے کندھوں پر محسوس کرتے ہیں۔ یہ دنیا فانی ایک امتحان گاہ ہے، جتنا بڑا مشن ہو گا اسی قدر سختیوں سے گزرنا پڑے گا۔ مولانا مدنی پر بیسیوں آزمائشیں آئیں اور وہ ان سے گزر کر عزیمت کے حامل رہے تاہم ایک آزمائش ایسی حائل رہی جو نشیب و فراز کے متنوع مراحل سے برسرپیکار رہی اور اس کے ساتھ اب بڑھاپا بھی شامل ہو گیا ہے۔ یہ آزمائش ان کی جسمانی صحت ہے جو جواں جذبوں کے باوصف مختلف عوارض کا شکار رہی ہے، وہ تقریباً پچاس سال سے متنوع اعصابی امراض کا شکار ہیں جسے طبی اصطلاح میں ڈپریشن کہتے ہیں۔ اس کی شدید صورت Nervous-Breakdown کے دوروں کی ہوتی ہے۔ مولانا مدنی کی ساری سرگرمیوں پر یہ برابر اثرانداز ہوتی رہی لیکن نفع بخشی کا پُرعزم جذبہ متزلزل نہ ہو سکا، جسے اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ علمی دینی صحافت کو جاری و ساری رکھنے کے لیے اب انہوں نے محدث کے لیے ایک نئی ٹیم تشکیل دی ہے جن میں زیادہ تر ان کے شاگردانِ رشید شامل ہیں۔ محدث کے لیے ایک مجلس تحریر بنائی گئی ہے ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر محمد اسلم صدیق	ڈاکٹر کامران طاہر	ڈاکٹر آصف جاوید
قاری فہد اللہ مراد	ڈاکٹر جواد حیدر	

جبکہ ادارتی ذمہ داریاں ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی کی نگرانی میں ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی اور راقم الحروف کے کندھوں پر ڈالی گئی ہیں۔

ہماری کوشش رہے گی کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اب محدث پابندی سے طبع ہو کر قارئین کی خدمت میں پہنچتا رہے ،اس میں تعطل پیدا نہ ہو۔ علماء کرام اور قلم کار حضرات سے گزارش ہے کہ محدث کے پلیٹ فارم سے حقیقی اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لیے ہمارے ساتھ علمی قلمی تعاون فرمائیں۔ والسلام

عبد الرحمن عزیز

رپورتاژ مجلس مذاکرہ

قرآن کریم کا رسم الخط نبوی ہے یا عثمانی؟

ترتیب: حافظ فہد اللہ مراد

قرآن کریم کی جمع صوتی رسول اللہ ﷺ کے عہد سے ثابت ہے اور اس کی حفاظت متواترہ کا بنیادی طریقہ قرآن کریم کی 'نص' بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ [العنکبوت:۴۹] "بلکہ وہ (قرآن) تو واضح آیات ہیں جو ان لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہیں جنہیں علم دیا گیا"۔ سے ثابت ہے جبکہ جمع کتابی 'مصلحت مرسلہ'[1] کے اصول کی بنیاد پر مشہور ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور زید بن ثابت انصاریؓ کا تفصیلی مکالمہ روایات حدیث موجود ہے۔ موجودہ قرآن کا تحریری نقش اول جامع قرآن خلیفہ راشد حضرت عثمان بن عفانؓ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے جس کا رسم الخط مع ترتیب سور ان کی سرپرستی میں حضرت زید بن ثابت انصاریؓ کی سربراہی میں اجل صحابہ کی کمیٹی کا تیار کردہ ہے۔ نماز کی امامت میں تو صرف وہی قراءات پڑھی جاسکتی ہیں جو رسم عثمانی کے مطابق ہوں البتہ دیگر اجل صحابہ 'سبعہ احرف' کی تلاوت کا بھی اہتمام کرتے رہے جو نبیؐ کی اجازت پر مبنی رہی لیکن وہ غیر سرکاری ہونے کی بناء پر تواتر سے ثابت نہیں۔ چونکہ تحقیق کا میدان محدثین اور فقہاء کا ہے اس لئے مذکورہ بالا نکات انہی سے لیے گئے جبکہ قاری حضرات کا زیادہ زور تلاوت و ادا پر ہوتا ہے جو تجوید و قراءت کا فن کہلاتا ہے۔ سطور ذیل میں مجلس التحقیق الاسلامی کے ایک علمی مذاکرے کی روئیداد دی جارہی ہے جس کے انعقاد سے قبل رسم عثمانی کو رسم نبوی قرار دینے والی جملہ روایات کی تخریج شرکاء کو مہیا کر دی گئی تھی کہ رسم نبوی کے بارے میں کوئی بھی معتبر روایت موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نام ہی رسم عثمانی ہے۔ قارئین شرکائے مذاکرہ کے دلائل پر غور کریں جو اس روئیداد میں پیش کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں تجوید و قرآن کے ساتھ ساتھ تحقیق کا ذوق بھی عطا فرمائیں۔

مجلس التحقیق الاسلامی ڈاکٹر حافظ عبد الرحمٰن مدنی حفظہ اللہ کے زیرِ سرپرستی گذشتہ پچاس برس سے علمی اور

---

۱ علم استدلال میں مصلحت مرسلہ سے مراد وہ علم و عمل ہوتا ہے جو کتاب و سنت سے تو ثابت نہ ہو لیکن مصلحت انفرادی یا اجتماعی کا تقاضا ہو اور مقاصدِ شریعت کے تحت ہو۔

تحقیقی منصوبوں پر کام کر رہی ہے، ماہنامہ محدث جو پاکستان بھر میں اپنا خاص علمی اور فکری تعارف رکھتا ہے اسی مجلس کا آرگن ہے اسی طرح سہ ماہی رشد بھی کلیۃ القرآن الکریم والعلوم العربیۃ کا عصری تقاضوں کے مطابق علمی پرچہ ہے جو اپنے چھ قراءات نمبرز کی بدولت عالمی سطح پر تعارف حاصل کر چکا ہے اور علم قراءت کے مباحث کے لیے ایک مرجع کی حیثیت رکھتا ہے۔ کلیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے علمی منصوبہ جات میں پاکستان کے علاوہ مصر، شام، کویت، قطر اور دیگر بلاد کے اہل علم اور ماہرین قراءات بھی شامل ہیں۔

مئی ۲۰۲۲ء میں کلیہ سے مستقل منسلک محققین کے علاوہ بہت ساری عالمی شخصیات بھی مجلس میں تشریف لائیں اور مجلس کے مختلف علمی منصوبہ جات کے حوالے سے پروگرامز اور علمی اجتماعات کا اہتمام کیا گیا جس میں علم قراءات کے بہت سارے گوشوں پر بھی عالمانہ گفتگوئیں ہوئیں اور کچھ نئے علمی سوالات فکر و نظر کے سامنے آئے جس پر مجلس نے یہ طے کیا کہ ان علمی مسائل پر علماء کرام اجتماعی طور پر غور و فکر کریں، تاکہ مباحث کو مزید نکھار کر پیش کیا جائے۔ اس سلسلے میں پہلا علمی مذاکرہ 'قرآن کریم کا رسم الخط نبویؐ ہے یا عثمانیؓ' کے عنوان سے طے پایا۔ کبار اہل علم کی طرف ایک خط مع تخریج روایات ارسال کر کے مذکورہ موضوع پر علمی گفتگو کے لیے مدعو کیا گیا، بحمد اللہ ۲۶ جون ۲۰۲۲ء کو تقریباً پچاس علمائے کرام نے شرکت کی اور اس موضوع پر جو گفتگو کی گئی اس کے اہم نکات پیش خدمت ہیں:

مجلس مذاکرہ کا باقاعدہ آغاز تلاوت کلام حمید سے کیا گیا ہے جو جامعہ لاہور الاسلامیہ کے شعبہ قراءات کے معلم جناب قاری محمد اکمل شاہین صاحب نے کی۔ اس کے بعد مذاکرے کے عنوان کا تعارف اور مقاصد پر راقم الحروف نے روشنی ڈالی، عرض کیا گیا کہ رسم قرآنی کے حوالے سے عام قاری حضرات اور فقہائے محدثین کی دو مختلف آراء ہیں: ایک یہ کہ قرآن کریم کا موجودہ رسم نبی اکرم ﷺ کا تیار کردہ ہے، اس کے دلائل کے طور پر قاری حضرات ایک روایت پیش کرتے ہیں، جس کا ذکر ڈاکٹر حافظ انس نضر کے حوالہ سے آگے آرہا ہے اس روایت کا غلط مفہوم یہ پیش کیا جاتا ہے کہ نبی ﷺ اپنے کاتبین کو لکھنے کی باقاعدہ ہدایات کے علاوہ ان کی کتابت درست بھی کرتے تھے۔ دوسری رائے کے مطابق قرآن مجید کا یہ رسم اس کمیٹی کا طے کردہ ہے جنہیں حضرت عثمانؓ نے مصحف تیار کرنے کے لیے مقرر کیا تھا، اور اسی نسبت سے اس کو رسم عثمانی کہا جاتا ہے۔

اس علمی اختلاف کی دو بنیادی توجیہات ملاحظہ فرمائیں:

ایک، قرآن کریم میں بہت سارے الفاظ کے لکھنے کا طریق تحریر کے مسلمہ قیاسی اصولوں کے خلاف ہے،

اور امت نے آج تک ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی۔۔'المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام' کے مصنف ڈاکٹر جواد علی نے لکھا ہے کہ عربی خط آغاز میں ایسا نہیں تھا جیسا کہ اب دکھائی دیتا ہے، بلکہ حالات کے ساتھ ساتھ اس میں کئی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، بہتر سے بہتر تلفظ (جس طرح ہم بولتے ہیں) کے قریب تر کتابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے، اس کے برعکس قرآن کریم کے خط کو بالکل بھی نہیں چھیڑا گیا، وہ جیسا تھا ویسے ہی رہنے دیا گیا۔

پہلی رائے کے حاملین کے بقول اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ خط رسول اللہ ﷺ سے مروی اور توقیفی ہے۔ اگر رسم قرآنی حضرت عثمانؓ غنی کی کمیٹی کا جاری کردہ ہوتا تو عام عربی خط کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تبدیلیاں آتیں۔

دوسرا، مصاحف عثمانیہ کے مابین بھی بعض کلمات کے رسم میں اختلاف تھا، جو اس کے مرفوع اور توقیفی ہونے کی طرف اشارہ ہے، جبکہ فقہائے محدثین کا موقف ہے کہ متعدد مصاحف میں جو کلمات مختلف انداز سے لکھے ہوئے ہیں وہ دراصل سبعۃ احرف کا تنوع ہے جسے سمونے کے لیے حضرت عثمانؓ نے پانچ مصاحف تیار کروا کے مرکزی شہروں میں قراء سمیت بھیجے تھے۔ صحابہ کرام کے اختلافات سبعۃ احرف کا تنوع تھا جس کی اجازت نبی ﷺ دیتے رہے لہٰذا درست بات یہی ہے کہ یہ رسم جناب عثمان غنیؓ کی سرپرستی میں اختیار کیا گیا۔

قاری خالد فاروق صاحب:

ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن کریم عہد نبوی میں لکھوا دیا گیا تھا۔ اگرچہ ایک جگہ جمع نہیں تھا بلکہ مختلف چیزوں پر لکھا ہوا تھا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں مکمل قرآن کریم کو مختلف صفحات کی شکل میں جمع کر لیا گیا۔ البتہ اکابر صحابہ کرام کے پاس جو ذاتی طور پر کچھ آیات، سورتیں یا ذاتی مصحف موجود تھے انہیں ختم نہیں کیا گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے دور میں صحابہ کرام پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جس نے پورے اہتمام کے ساتھ قرآن کریم کو جمع کیا اور آخر میں جناب صدیق اکبرؓ کے لکھوائے گئے صحیفوں سے مقابلہ بھی کیا گیا۔ جو حضرت حفصہؓ کے پاس محفوظ تھے، انفرادی حیثیت میں عام صحابہ کے پاس جو آیات، سورتیں یا مصاحف لکھے ہوئے موجود تھے انہیں جلا دیا گیا۔ اس وقت قریش میں جو رسم چل رہا تھا اس کے مطابق مصاحف لکھے گئے، اس حوالے سے کمیٹی میں کوئی اختلاف نہیں ہوا سوائے ایک کلمے 'التَّابُوت' کے، اس میں اختلاف ہوا کہ کتابت گول 'ۃ' کے ساتھ کی جائے یا لمبی 'ت' کے ساتھ۔ حضرت عثمانؓ نے اس اختلاف کو یوں حل کیا کہ اسے

لغت قریش کے مطابق لکھوا دیا کیونکہ پہلا حرفِ قرآن لغت قریش میں نازل ہوا تھا، لہٰذا 'التابوت' کو لمبی 'ت' کے ساتھ لکھ دیا گیا۔ رسم قرآن کریم کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے چند باتیں بطور اصول سمجھنا ضروری ہیں:

علمائے رسم کے ہاں رسم کی دو قسمیں ہیں: قیاسی اور اصطلاحی۔ رسم قیاسی یہ ہے کہ عربی خط و کتابت کے معروف اصولوں پر لفظ کو لکھ دیا جائے۔ جبکہ رسم اصطلاحی سے مراد رسم عثمانیؓ ہے، اس کے بہت سارے کلمات رسم قیاسی کے اصولوں کے مطابق نہیں۔ رسم عثمانیؓ کے امتیازات کو پانچ انواع میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱. کسی حرف کی کمی کے ساتھ کلمات کو لکھا جائے، یعنی تلفظ میں حرف موجود ہو لیکن رسم میں اسے حذف کر دیا جائے، یہ عام طور پر الف، واؤ اور یا میں ہوتا ہے۔ جیسے 'وَاعَدْنَا' کو حذف الف کے ساتھ لکھا گیا ہے، قراء کرام نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس میں دو قراءات ہیں واعدنا اور وعدنا۔ بغیر الف کے لکھنے سے دونوں قراءات کا امکان ہے جبکہ بالالف لکھنے سے دوسری قراءت نہیں ہو سکتی جیسے جمع مذکر سالم کے کلمات 'العلمین' وغیرہ ہیں، اسی طرح جمع مؤنث سالم کے کچھ کلمات بھی بغیر الف کے مکتوب ہیں جیسے 'ذرّیتهم' وغیرہ۔ ایسے ہی بعض کلمات حذف واؤ اور حذف یاء کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

اسی طرح ہمزہ وصلی کے بارے میں اصول یہ ہے کہ اسے الف کی شکل میں لکھا جائے لیکن قرآن کریم میں جب امر کے صیغوں میں واؤ اور فا کے بعد ہمزہ وصلی آتا ہے تو اس کو حذف کر دیا جاتا ہے، جیسے 'فسئلوا' میں ف کے بعد الف نہیں لکھا گیا۔

۲. کسی حرف کی زیادتی کے ساتھ مثلاً الف، واؤ، یاء کو زیادہ کر دینا جیسے أولئك۔

۳. ایک حرف کی دوسرے حرف سے تبدیلی، بدل یا عوض میں ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف لکھ دیا گیا۔

۴. مقطوع اور موصول کا مسئلہ، یعنی بعض کلمات کو کچھ مقامات پر ملا کر لکھا گیا ہے اور بعض جگہ پر الگ الگ کر کے، مثلاً 'أن اور لا' ہیں بعض جگہوں پر انہیں مقطوع (یعنی الگ الگ کر کے) لکھا گیا ہے اور بعض مقامات پر موصول (یعنی ملا کر) لکھا گیا ہے، جیسے أَنْ لَا اور أَلَّا، پہلے میں نون رسم میں موجود ہے جبکہ دوسرے میں حذف ہے۔ اس کا اثر وقف اضطراری میں ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی مثال میں أن پر وقف ہو سکتا ہے جبکہ دوسری میں الف پر۔

اسی طرح لام جارہ ہے یہ پورے قرآن مجید میں چار جگہوں پر مقطوع یعنی اسم مجرور سے کاٹ کر لکھا گیا ہے: جیسے 'مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ'، 'مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ'' فَمَالِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ'، 'فَمَالِ الَّذِينَ'۔

اسی طرح 'بِئْسَمَا' کو عام طور موصول لکھا جاتا ہے لیکن بعض کلمات میں یہ کاٹ کر لکھا گیا ہے، اسی طرح 'حَیْثُمَا' بھی کہیں ملا کے لکھا ہوتا ہے اور کہیں 'حیث' اور 'ما' جدا جدا مکتوب ہے۔

۵. تائے تانیث یہ گول 'ۃ' کی شکل میں لکھی جاتی ہے لیکن کچھ کلمات لمبی 'ت' کے ساتھ لکھے گئے ہیں، مثلاً 'رحمت، جنت، لعنت اور شجرت' ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ لمبی 'ت' کے ساتھ کیوں لکھے گئے اور گول 'ۃ' کے ساتھ کیوں نہیں لکھے گئے یا موجودہ شکل میں کس نے لکھوائے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جب قرآن مجید لکھا گیا تو تب کوئی اختلاف نہیں تھا، اختلاف تو صرف ایک کلمہ 'التابوت' میں ہوا تھا وہ بھی حضرت عثمانؓ نے لغت قریش کے مطابق لکھنے کا حکم دے کر اختلاف ختم کرا دیا۔

۶. بعض کلمات ایک حرف کے ساتھ لکھے گئے ہیں لیکن اس میں دو قراء آت ہیں، جیسے کلمہ بِمُصَیْطِرٍ صاد کے ساتھ لکھا گیا ہے لیکن اس کے اوپر 'س' لکھ دیا گیا ہے، جو دوسری قراءۃ کی طرف اشارہ ہے۔

ڈاکٹر حافظ عبد الرحمٰن مدنی حفظہ اللہ

اس کے بعد مدنی صاحب نے اس سلسلے میں اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا فن روایت پر جو کام ہوا ہے اس میں یہ بات بڑی واضح ہے کہ جب کسی چیز کی نسبت کسی شخص کی طرف کی جاتی ہے تو واضح کیا جاتا ہے کہ اسے بیان کرنے والے نے کس طرح بیان کیا، اور لینے والے نے کیسے لیا، اس کو فنِ 'تحمل و اداء' کہتے ہیں۔ اگرچہ قرآن مجید کی اصطلاح میں تھوڑا سا فرق ہے اس میں تحمل واداء کی بجائے 'تلقی و اداء' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ جب تک یہ بات ثابت نہ ہو کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ بات کہی ہے یا آپ نے یہ کام کیا ہے یا آپ کے سامنے یہ کام ہوا اور آپ نے اس کو برقرار رکھا ہے تب تک کسی روایت کو مرفوع نہیں کہا جا سکتا۔

فن روایت وحدیث میں مفروضہ کوئی چیز نہیں ہے جیسے کہ کوئی اعلیٰ قسم کی بات بنادیں اور کہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ سے ہی ایسی حدیث ہو سکتی ہے، یہ ممکن نہیں ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ کسی نے اس خط کو بدلا نہیں چنانچہ وجہ یہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا لکھا ہوا رسم الخط تھا۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بالاتفاق صحابہ نے شروع کیں لیکن آج تک انہیں تبدیل نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر جمعہ کی دو اذانیں، یہ حضرت عثمانؓ نے شروع کیں، اس کے متعلق صحیح بخاری کے الفاظ ہیں: وثبت الأمر علی ذالک (اس کے بعد اسی پر اذان کے معمولات جاری وساری رہے) یعنی لوگوں نے جمعہ کی دو اذانیں کہنا شروع کر دیں۔ لہٰذا تبدیلی نہ کرنے کو بنیاد بنا کر یہ

نہیں کہہ سکتے کہ یہ رسم الخط نبی اکرم ﷺ کا مقرر کردہ ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں یہ صراحت ہے:
﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۞ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۞﴾ [العنکبوت: ٤٨، ٤٩]

"نبی اکرم ﷺ اس قرآن کے اترنے سے پہلے نہ تو تلاوت کر سکتے تھے اور نہ ہی آپ لکھ سکتے تھے اور نبی اکرم ﷺ کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ نے یہ حکمت اختیار کی ہے کہ آپ کو نہ پڑھنا سکھایا ہے اور نہ لکھنا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کہیں لوگ اس شک میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ آپ کہیں سے لکھ کر لے آتے ہیں، تاریخ میں پہلی دفعہ ابو لولید باجیؒ نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ قرآن اترنے سے پہلے نہیں لکھ سکتے تھے لیکن بعد میں آپ پڑھنے اور لکھنے لگے تھے۔ اس کی تردید کے لیے یہی کافی ہے کہ بعثت کے انیس سال بعد صلح حدیبیہ کے موقع پر کاتب حضرت علیؓ تھے جنہوں نے معاہدے میں محمد "رسول اللہ" لکھ دیا، تو قریش کے سفیر سہیل بن عمرو نے کہا کہ اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول مان لیں تو ہمارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے، ہم اسے نہیں مانتے اس لیے ان الفاظ کو کاٹیے۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ ان کو کاٹ دو، انہوں نے عرض کیا کہ میں یہ جسارت نہیں کر سکتا۔ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں کہ جب حضرت علیؓ نے "رسول اللہ" کے الفاظ کاٹنے سے انکار کیا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے علی! مجھے دکھاؤ کہ "رسول اللہ" کے الفاظ کہاں لکھے ہیں؟ جب حضرت علیؓ نے آپ کو دکھایا تو آپ نے ان الفاظ کو اپنے ہاتھ سے مٹا دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سنہ ٦ ہجری صلح حدیبیہ تک عبارت دیکھ کر یہ بھی نہیں جان سکتے تھے کہ "رسول اللہ" کہاں لکھا ہوا ہے۔

اس کے برعکس جب ابو الولید باجیؒ نے یہ بات کہی کہ نبوت کے بعد آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے تو علمائے اندلس نے ان پر مرتد اور زندیق ہونے کا فتویٰ لگا دیا کہ قرآن مجید کی نص کی مخالفت کر رہا ہے۔ جب یہ معاملہ وقت کے امیر کے پاس گیا تو اس نے ابو الولید باجیؒ کو بلا کر پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ قرآن کریم کے الفاظ 'من قبلہ' کا مفہوم مخالف یہ بنتا ہے کہ آپ قرآن مجید کے اترنے سے پہلے نہیں لکھ سکتے تھے لیکن بعد میں آپؐ لکھنے پڑھنے لگ گئے تھے۔ اس تاویل کی بنا پر امیر نے ان کو قتل تو نہیں کیا لیکن ان کی تاویل غلط تھی کیونکہ اصول یہ ہے کہ جس دلیل اور وجہ کی بنیاد پر کوئی چیز رکھی گئی ہو اگر وہ وجہ باقی رہے تو وہ حکم بھی باقی رہتا ہے۔ اگر نبی اکرم ﷺ کو وحی آنے یا قرآن مجید اترنے کے بعد لکھنا پڑھنا آگیا تھا تو پھر وہ وجہ تو موجود تھی قرآن تو زندگی کے آخری دموں تک اترتا رہا ہے لہٰذا وہ وجہ زندگی کے آخری دموں تک موجود تھی: إِذًا

لَارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ،(تو باطل پرست اس کو قرآن کریم میں شک کا ذریعہ بنا لیتے) دوسری بات یہ ہے کہ آپؐ کی صفت اُمیت قرآن کریم نے سورۃ الاعراف وغیرہ میں بیان کی ہے، ان کے موقف کے مطابق وحی اول کے وقت آپ کی یہ صفت اُمیت ختم ہو چکی تھی اور آپؐ خواندہ ہو گئے تھے۔ پھر قرآن کریم کا ایک عرصہ کے بعد اس کو آپ ﷺ کے وصف کے طور پر ذکر کرنا خلاف واقعہ بات ہے۔

قرآن مجید کے محفوظ ہونے کی مضبوط بنیاد ایک ہی ہے کہ وہ سینوں میں محفوظ تھا اور انہی میں محفوظ رہے گا: ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾

مزید یہ کہ قرآن مجید کی تلاوت کی جتنی بھی باریکیاں ہیں ان کو تحریر میں نہیں لایا جا سکتا، اس کا واحد ذریعہ تلاوت ہی ہے اگر آپ تلاوت کے ماہر نہ ہوں تو اشمام کیسے لکھیں گے۔

عہد نبوت میں قرآن اترتا تو آپ بولتے جاتے اور مقرر کردہ کاتبین وہ لکھ لیتے تھے۔ قرآن مجید اس وقت ٹھکریوں، کھجوروں کے چھالوں، اور پتھروں پر لکھا جاتا تھا، جن پر لکھنا بڑا ہی مشکل کام تھا۔

نبی اکرم ﷺ کے بارے میں کوئی چیز ایسی موجود نہیں ہے کہ آپ نے قرآن مجید لکھواتے ہوئے کاتب کو کسی لفظ کی کتابت خود صحیح کرائی ہو، اگر ایسی کوئی حدیث بیان کی جاتی ہے تو وہ شدید ضعیف بلکہ موضوع ہے۔

حضرت عثمانؓ نے مصحف تیار کرنے کے لیے جو کمیٹی مقرر کی تھی ان کے لیے جو ہدایات تھیں، اس کی تمام مثالیں جو پیش کی جاتی ہیں یہ بتا رہی ہیں کہ لکھنے کے لیے کچھ خاص انداز اختیار کیے گئے تھے جیسے کہ 'ت' کو کہیں لمبا لکھا گیا ہے اور کہیں گول 'ۃ'۔ ابراہیم کا لفظ کہیں 'ی' کے ساتھ لکھا گیا ہے اور کہیں بغیر 'ی' کے۔ ان ساری چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قریش کے رسم الخط کو ترجیح دی ہے۔ بلکہ 'التابوت' کی 'ۃ' کو گول لکھنے سے متعلق حضرت عثمانؓ نے جو ہدایت دی ہے وہ اختلاف کے وقت دی ہے کہ تمہارے اور زید کے مابین کسی کلمہ کی کتابت میں اختلاف ہو تو قریش کی لغت کو ترجیح دو، بعض لوگوں نے اس کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ اصل قریش کی لغت ہونی چاہیے، کیونکہ حضرت عثمانؓ نے ایسا رسم الخط تیار کیا کہ اس میں سبعۃ احرف کی گنجائش موجود رہے۔ اگر کوئی ایسی تبدیلی تھی جو رسم الخط میں سما نہیں سکتی تھی یعنی الفاظ کی کمی بیشی کو تو قرآن مجید کے مختلف نسخوں میں سمو دیا گیا، کسی نسخے میں ایک لفظ کا اضافہ ہے جبکہ دوسرے میں کمی ہے۔ یہ نسخے اسی غرض سے الگ الگ لکھے گئے تھے حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے پانچ نسخے نہیں لکھوائے۔ نبی اکرم ﷺ کے لکھنے والوں نے کوئی مخصوص رسم الخط اختیار نہیں کیا، چونکہ وہ سب لوگ ایک ہی خاندان،

ایک ہی علاقے یا ایک ہی طرز کی کتابت سیکھے ہوئے نہیں تھے کہ وہ کسی مخصوص رسم خط کو اختیار کرتے بلکہ کاتبین میں انصاری بھی شامل تھے اور مہاجر بھی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے یا حضرت عثمانؓ نے اپنے دور میں جو کمیٹی بنائی تھی ان کے ہیڈ زید بن ثابت تھے جو انصاری ہیں۔ جبکہ قرآن لکھنے کے لئے کوئی رسم الخط اختیار کیا گیا شاید اس دور میں کوئی رسم الخط ہی قریش کا اصل رسم الخط ہو گا۔

جب نبی اکرم ﷺ کا پڑھنا لکھنا ثابت نہیں ہے، تو اس کا ثبوت کیسے ممکن ہے کہ آپؐ باقاعدہ الفاظ کی کتابت صحیح کرواتے تھے کہ یہاں لمبا کیا جائے، یہاں شوشا ہو، یہاں گول تا اور یہاں لمبی تا ہو وغیرہ وغیرہ۔

یہاں دو باتیں بہت اہم ہیں جس سے اس مسئلہ کی حقیقت واضح ہوتی ہے: ایک یہ کہ نبی اکرم ﷺ واقعی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، دوسرا یہ کہ، کوئی ایک صحیح مستند روایت مل جائے کہ نبی اکرم ﷺ نے کہیں کہا ہو کہ اس لفظ کو یوں درست کرو، اگر یہ ثابت نہیں ہوتا تو رسم نبوی ایک مفروضہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

ڈاکٹر حافظ انس نضر مدنی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ [العنکبوت: ٤٨]

یہ بات درست ہے کہ نبی کریم ﷺ قرآن کریم نازل ہونے سے پہلے لکھنا پڑھنا جانتے ہوتے تو چونکہ قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ سابقہ اقوام کے واقعات پر مشتمل ہے، اس سے معترض لوگ کہہ سکتے تھے کہ آپ نے تورات اور انجیل سے اخذ کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک معجزاتی انداز میں ذکر کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا بہت بڑا معجزہ ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اس کے باوجود آپ نے وہ چیزیں پیش کی ہیں جس میں پرانے قصے بھی ہیں، آئندہ کی پیشگوئیاں بھی ہیں اور ہدایات بھی ہیں، جس طرح یہ معجزہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوئے بھی لوگوں کے سامنے قرآن کریم پیش کیا ہے اسی طرح یہ بھی ایک بہت بڑا معجزہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوئے کتابتِ قرآن کریم کی تصحیح کی۔ جن صحابہ کرام نے لکھا ہے اور یہ نبی کریم ﷺ کے سامنے لکھا گیا ہے یہ ایک بھی بہت بڑا معجزہ ہے۔ جو قراء رسم عثمانی کے نبوی اور مرفوع ہونے کے قائل ہیں ان میں سے کسی کا یہ موقف نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اگر کسی کا موقف یہ ہے تو اس کی دلیل قرآن کریم کی وہ آیت ہے جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ قرآن

سال بعد سکھایا، پانچ سال بعد سکھایا، دس سال بعد سکھایا، یا بیس سال بعد سکھایا جب بھی سکھایا تو قرآن مجید جیسے ہی نازل ہوا تو نبی کریم ﷺ نے قرآن مجید لکھوانا شروع کر دیا تھا۔

کتاب النبی ﷺ کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ میں آپ ﷺ کے کاتبین چھیالیس کے قریب بتائے گئے ہیں جن سے آپ نے قرآن کریم لکھوایا ہے۔ کیا ہم تصور کر سکتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ قرآن کریم لکھوا رہے ہوں اور وہ اپنی مرضی سے لکھ رہے ہوں، یہ تصور کر لینا کہ صحابہ کرام نے اپنے اجتہاد[1] سے لکھ دیا پھر تو یہ بھی تصور کر لیں کہ صحابہ کرام نے غلط لکھ دیا ہو گا، کسی نے آیت ہی غلط لکھ دی ہو گی یا کسی نے لفظ غلط لکھ دیا ہو گا، لہٰذا جو کچھ نبی کریم ﷺ نے لکھوایا ہے وہ اللہ رب العالمین کی نگرانی میں تھا اور یہ نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے کہ لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوئے بھی اتنا اہتمام فرمایا کہ شروع میں آپ ﷺ نے احادیث مبارکہ لکھنے سے منع کر دیا بلکہ یہاں تک فرمایا کہ جس نے کوئی حدیث لکھی ہے وہ حدیث کو مٹا دے، بعد میں جب صحابہ کرام میں یہ امتیاز پیدا ہو گیا تو آپ ﷺ نے قرآن کے علاوہ حدیث لکھنے کی بھی اجازت دے دی۔

رسم قرآن کریم کو صحابہ کرام کا اجتہاد بنانا عجیب موقف ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام نے اپنی مرضی سے قرآن کریم کو جیسے چاہا لکھ دیا۔ صحابہ کرام نے قرآن کریم نبی اکرم ﷺ کے حکم سے اور آپ کے سامنے لکھا ہے بلکہ احادیث میں تو یہاں تک موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ اس میں تصحیح بھی کروایا کرتے تھے۔

«عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ: «كُنْتُ أَكْتُبُ الْوَحْيَ لِرَسُولِ اللَّهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ أَخَذَتْهُ بُرَحَاءُ شَدِيدَةٌ، وَعَرِقَ عَرَقًا شَدِيدًا مِثْلَ الْجُمَّانِ، ثُمَّ سُرِّيَ عَنْهُ، فَكُنْتُ أَدْخُلُ عَلَيْهِ بِقِطْعَةِ الْكَتِفِ أَوْ كِسْرَةٍ، فَأَكْتُبُ وَهُوَ يُمْلِي عَلَيَّ، فَمَا أَفْرَغُ حَتَّى تَكَادَ رِجْلِي تَنْكَسِرُ مِنْ ثِقَلِ الْقُرْآنِ حَتَّى أَقُولَ: لَا أَمْشِي عَلَى رِجْلِي أَبَدًا، فَإِذَا فَرَغْتُ قَالَ:"اقْرَأْ "، فَأَقْرَأُهُ، فَإِنْ كَانَ فِيهِ سَقْطٌ أَقَامَهُ، ثُمَّ أَخْرُجُ بِهِ إِلَى النَّاسِ» [2].

سیدنا ابو بکر صدیقؓ کے دور میں یہ اہم مسئلہ پیدا ہوا کہ جنگ یمامہ میں بہت سارے قرآن کے حافظ شہید

---

۱ اجتہاد کی اصطلاح فن فقہ کی ہے جبکہ نبی ﷺ کا صحابہ کو لکھوانا اجتہاد نہیں کہلاتا۔

۲ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (١/ ١٥٢) :٦٨٤

ہو گئے، جس سے حضرت عمرؓ کے دل میں قرآن کی ایک ماسٹر کاپی تیار کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سامنے انہوں نے اپنی تجویز پیش کی تو اوّل اوّل وہ تیار نہیں ہوئے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ کام نہیں کیا تو ہم کیوں کریں؟ حضرت عمرؓ مسلسل توجہ دلا رہے تھے کہ نبی اکرم ﷺ نے قرآن کریم کو تلاوت کی صورت میں جمع کیا ہے اگرچہ کتابی صورت میں نہیں کیا ۔ اہل قرآن صحابہ کی شہادت کی وجہ سے ضرورت محسوس ہوئی کہ اسے لکھ بھی لیا جائے، بار بار افہام و تفہیم کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اطمینان قلب حاصل ہو گیا تو انہوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کو اس مقصد کے لیے تیار کیا۔ لہٰذا جمع صدیقی اسی رسم الخط کے مطابق تھی جس پر نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کو کتابت کروائی تھی اور جمع عثمانیؓ بھی اسی نبوی رسم الخط پر تھی کوئی نئی نہیں تھی۔ حالانکہ جمع قرآن تو اللہ کی ذمہ داری ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝﴾ [القیامۃ:۱۷، ۱۸]

نبی کریم ﷺ کے دور میں ہونے والے کام کو جمع نبوی کہہ دیتے ہیں، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اگلا قدم اٹھایا تو اسے جمع صدیقیؓ کہنے لگے۔ جب حضرت عثمان نے تحقیق مزید کے طور پر یہ کام تیسری بار کیا تو اسی نسبت سے اس کو جمع عثمانی کہا گیا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ رسم کے سینکڑوں ہزاروں اختلافات ہیں ان کلمات کی تطبیق کو چھوڑ کر ہم ایک نظریاتی بحث کر رہے ہیں حالانکہ اس کا اثر سینکڑوں ہزاروں کلمات کے وقف اور ابتداء پر پڑتا ہے۔ اگر ہم یہ موقف اختیار کر لیں کہ رسم عثمانی اجتہادی ہے تو قرآن کریم کے کلمات کے ابتداء اور وقف میں بے حد پیچیدہ مسائل سامنے آتے ہیں۔ مثلاً 'فمال ھولاء القوم' میں ابتداء 'ھولاء' سے کریں گے یا 'ل' سے، ایسے ہی 'فمال' میں لام پر وقف درست قرار پائے گا یا نہیں۔ ہم یہاں ان تطبیقی بحثوں سے قطع نظر ایک نظریاتی بحث کر رہے ہیں۔

رسم عثمانی کے توقیفی ہونے کے قائلین اس موضوع کو اس انداز سے نہیں لیتے کہ نبی اکرم ﷺ لکھنا پڑھنا جانتے تھے یا نہیں؟ یا شروع میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتے لیکن بعد میں جان گئے تھے۔ اگر ایسا ہے تو آپ خود ہی قرآن لکھ لیتے، نبی اکرم ﷺ کا یہ معجزہ در معجزہ ہے کہ آپ ﷺ نے لکھنا پڑھنا نہ جاننے کے باوجود خود لکھوایا ہے، اور صحابہ کرام نے آپ کے سامنے لکھا ہے۔ قرآن مجید کا لکھنا نبی اکرم ﷺ کی "تقریر" ہے اور "تقریر" بھی نبی اکرم ﷺ کی سنت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ

ڈاکٹر مدنی صاحب کا تبصرہ لمبا تھا جو نکات بعد میں بولنے والوں کی گفتگو میں آچکے ہیں لہٰذا انہیں چھوڑ کر ہم حدیث مذکورہ بالا میں الفاظ (فَإِنْ كَانَ فِيهِ سَقْطٌ أَقَامَهُ) کا درست مفہوم ذکر کر رہے ہیں۔ مدنی صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر حافظ انس نضر کو ان الفاظ کے سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے۔ مدنی صاحب نے اس کی مثال کے لیے نابینا علماء شیخ ابن بازؒ وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے واضح کیا کہ وہ اپنی املاء کردہ عبارتیں دوبارہ سنتے تو لکھنے والے کی غلطی درست کروا دیتے۔ ان الفاظ کا مفہوم بھی یہی ہے کہ آپؐ قرآن کریم املاء کروانے کے بعد کاتب سے سنتے اور اگر کوئی چیز چھوٹ گئی ہو تو اسے درست کروا دیتے بلکہ أَقَامَهُ کا لفظ بتا رہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کاتب سے تصحیح کرواتے خود صحیح نہیں کرتے تھے، گویا اس سے آپؐ کا لکھنا پڑھنا ثابت نہیں ہوتا۔

حافظ فہد اللہ مراد (مدیر التعلیم جامعہ عزیزیہ)

ڈاکٹر حافظ انس نضر کی گفتگو میں دو امور واضح کیے گئے ہیں: ایک یہ کہ نبی اکرم ﷺ لکھواتے تھے، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ نبی اکرم ﷺ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، علماء کے مابین اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اب ان دونوں کو جمع کیسے کیا جائے؟۔ اس پر ڈاکٹر انس نضر نے فرمایا ہے کہ آپ کتابت کی درستگی معجزانہ طور پر کرواتے تھے جبکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ لکھوانے کے بعد کاتب کو لکھے ہوئے کو پڑھنے کا حکم دیتے اور اس کی سماعت فرماتے، اس میں کوئی کمی پیش رہ جاتی تو اسے پورا کروا دیتے۔ کسی بھی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپؐ نے کاتبین وحی کے لکھے ہوئے کو دیکھ کر پڑھا ہو اور پھر نشان دہی کی ہو کہ یہ غلطی ہے اسے درست کر دو۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ آپ معجزانہ طور پر کتابت درست کرواتے تھے تو اسے درست کروانے کی کوئی عملی مثال نہیں ملتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابت میں اعتماد کاتبین پر تھا چونکہ وہ کتابت کے ماہر تھے جبکہ اس کے تلفظ میں اعتماد رسول اللہ ﷺ پر تھا۔

ڈاکٹر حافظ انس نضر مدنی

'اقامہ' سے پہلے لکھوانا نبی اکرم ﷺ کی تقریر ہے، جبکہ دوسرے موقف کا نتیجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کا لکھنا اجتہادی امر تھا۔ میں کہتا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ کا لکھوانا نبی ﷺ کی تقریر تھی جو اللہ کی نگرانی میں ہوتی تھی، 'اقامہ' کا لفظ اس کی تائید کر رہا ہے۔

(تبصرہ: اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے نیز اسے اجتہادی کہنا بھی غلط ہے)

حافظ فہد اللہ مراد

اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں دو باتیں ہیں: رسول اللہ ﷺ کا لکھوانا تقریری تھا یا صحابی کی کتابت تقریری تھی۔ نبی اکرم ﷺ کا معجزاتی طور پر لکھنا، یا رسول اللہ ﷺ کا معجزاتی طور پر قرآن کا لکھوانا اور کاتبوں سے ہونے والی غلطیاں معجزاتی طور پر سمجھ جانا اور ان کی تصحیح کرانا، اس کی کوئی دلیل ہونی چاہیے۔ یہ تو ثابت ہو گیا ہے کہ املاء کرواتے تھے اور اسے دوبارہ پڑھا کر سنتے تھے۔ ذخیرہ حدیث میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فلاں موقعہ پر قرآن کا کوئی لفظ لکھا، یا آپ نے فلاں لفظ دیکھ کر ٹھیک کرایا۔

نبی اکرم ﷺ کا بول کر کتابت کروانا، املاء تقریری نہیں بلکہ قولی حدیث ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے دور میں جس صحابی نے کتابت کی تھی وہ درست تھی کہ نہیں؟ یہی کافی ہے کہ صحابہ ماہرین تھے لہٰذا ان کی کتابت درست ہوتی تھی۔ نیز صحابہ عدول تھے اس لیے ان کی کتابت بھی درست تھی۔

ڈاکٹر حافظ انس نضر مدنی

آپ ﷺ نے اجتہاد کیا کہ نہیں۔ جہاں اللہ کی طرف سے اصلاح نہیں آئی وہاں آپ کا اجتہاد وحی بن گیا اور جہاں اللہ کی طرف سے اصلاح آگئی وہاں اصلاح کے بعد وحی بن گیا۔ اب نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو لکھوایا جہاں نبی اکرم ﷺ نے اصلاح فرما دی وہ تقریری وحی بن گئی اور جہاں آپ نے اصلاح نہیں فرمائی وہاں آپ کا اصلاح نہ فرمانا وحی ہے۔

قاری فہد اللہ مراد

شیخ محترم! یہاں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ صحابہ کرام میں سے کاتبین وحی تقریباً چھیالیس ہیں اور بعض نے ساٹھ بھی لکھے ہیں، حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور میں لکھنے والے ایک آدمی زید بن ثابتؓ ہیں اور حضرت عثمانؓ کے دور میں زیادہ سے زیادہ گیارہ لوگ ثابت ہوتے ہیں۔ اگر چھیالیس کاتبین وحی کی کتابت تقریر نبوی تھی تو حضرت زید بن ثابتؓ کو کیسے پتہ چل گیا کہ اس میں تقریری کیا ہے؟

مولانا علی مرتضیٰ طاہر (شیخ الحدیث جامعہ ام حبیبہ، لاہور)

اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ رسم قرآنی کے بارے میں جو اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ آیا یہ رسم قرآنی ہے یا رسم نبوی ہے اس بارے میں میری رائے یہ ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے درست قراءت سکھائی ہے اور لکھنے کے بارے میں وسعت رکھی گئی ہے، اس بارے میں کاتبین وحی پر پورا اعتماد کیا گیا ہے وہ اپنی مہارتِ کتابت کے ساتھ لکھتے تھے اور نبی اکرم ﷺ کو پڑھ کر سناتے تھے جب صحابی کی قراءۃ رسول اللہ ﷺ کی

قراءۃ کے موافق ہوتی تو یہ عمل مکمل ہو جاتا ہے اور جہاں کوئی لفظ چھوٹ جاتا آپ اس کو درست کروا دیتے۔

اس وسعت کی مثال یہ ہے کہ لفظ 'ابراھیم' سورۃ بقرہ میں بغیر یاء کے مکتوب ہے اور بقیہ مقامات پر یاء کے ساتھ مکتوب ہے جبکہ یہ رسم دو قراءتوں کو شامل ہے کیونکہ وہاں نقطے موجود نہ تھے زیادہ سے زیادہ شوشے کا فرق تھا اور نبی اکرم ﷺ کے حکم پر ان شوشوں کے فرق کو ثابت کرنا ممکن نہیں ہے ایسے ہی جو یہ کہا جا رہا ہے کہ 'تابوت' کی تاء کو گول تاء سے لکھنا ہے یا لمبی سے وہاں گول اور لمبی تاء کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہاں لفظ ہیں 'فاکتبوہ بالتاء' اب یہاں سے کیسے متعین ہوا کہ لمبی تاء سے لکھنا ہے اس کا مطلب ہے اختلاف ھا اور تاء کے لکھنے کا تھا اس لیے حضرت عثمانؓ نے لمبی تا متعین کر دی۔ لہذا موجودہ رسم الخط رسم عثمانی ہے جو کاتبین صحابہ کے فہم اور مہارت پر منحصر تھا۔ علاوہ ازیں حضرت عثمانؓ سے پہلے کاتبین وحی مختلف قبائل سے تھے تو کتابت کا اسٹائل بھی مختلف تھا۔ رسم عثمانی پر صحابہ کے درمیان کوئی گفتگو یا اختلاف نہیں ہوا جو بتا رہا ہے کہ اس معاملے میں خاصی وسعت تھی۔

ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی

آپ کہہ رہے تھے کہ لغت قریش کے مطابق لکھا، ایک کلمہ 'الْعُلَمٰٓؤُا' ہے جو سورۃ فاطر میں واؤ کے ساتھ اور باقی پورے قرآن میں الف کے ساتھ 'العلماء' لکھا ہوا ہے۔ اس پر قراءتوں کے متعدد مسائل ہیں، قراءۃ حمزہ متواتر ہے اس میں اس واؤ کی رسم کی وجہ سے بارہ قراءتیں جائز ہیں۔ اگر واؤ کے ساتھ نہیں لکھا گیا تو اس میں پانچ وجہیں ہیں۔ مثلاً سورت فاطر والے 'الْعُلَمٰٓؤُا' میں صرف ایک قول ہے کہ یہ واؤ کے ساتھ ہے اور سورت شعراء کے کلمے میں علمائے رسم کے دو قول ہیں: واؤ کے ساتھ لکھا جائے یا واؤ کے بغیر۔

نبی اکرم ﷺ کے ذمہ پڑھنا اور پڑھانا دونوں چیزیں تھیں جس میں وصل اور وقف کی کیفیت کا فرق بتانا بھی شامل تھا۔ فَمَالِ میں لام کاٹ کر وقف کرنا ہے یا ملا کر حدیث کے الفاظ ہیں 'کنت أکتب الوحی' اور آگے جا کر لفظ ہیں 'فاقرأہ' کہ پڑھ کر سناؤ، آپ کا اقرأ وصل، وقف، ابتداء ان تینوں شکلوں پر تھا۔

ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ

اس بحث میں جب ہم یہ بات کہہ رہے ہیں کہ یہ رسم نبوی نہیں ہے تو یہ رسم قرآنی کے بارے میں کوئی انتہائی موقف نہیں ہے بلکہ یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ صحابہ کرام بڑے عالم تھے اور انہوں نے بہت اہتمام کیا ہے جبکہ رسم الخط میں بہت ساری حکمتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ یقیناً صحابہ کرام بہت بڑے ماہرین قرآن اور قراءات تھے انہوں نے ایک ایک بات کو ملحوظ رکھا ہے مثال کے طور پر لفظ 'ابراھیم' میں جہاں یاء

کے شوشے کے بغیر کتابت ہے وہ بلا سبب نہیں بلکہ اس امر کی طرف اشارہ کرنا مطلوب ہے کہ 'ابراہیم' کا اصل نام 'ابراھام' تھا کیونکہ آپ علیہ السلام اصلاً عبرانی تھے، لہذا ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی رسم عثمانی میں موجود حکمتوں پر غور کرنا چاہیے نہ کہ بغیر کسی ثبوت کے اسے رسم نبوی بنا دیں۔

ڈاکٹر حافظ انس نضر مدنی اور ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ

آپ نے مدنی صاحب کی گفتگو پر یہ اعتراض کیا کہ صحابہ نے اپنی مرضی سے کر لیا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے جس پر جناب ڈاکٹر حافظ عبد الرحمٰن مدنی صاحب نے جواب دیا کہ صحابہ کرام کی تلاوت اپنی مرضی نہیں تھی البتہ رسم عثمانی کا تبین صحابہ کا اتفاقی عمل تھا گویا قرآن کریم کی تدوین بھی صحابہ کرام کے اتفاق کی مرہون احسان ہے۔ مزید یہ اعتراض بھی اٹھایا گیا کہ اگر آپ رسم قرآنی کے نبوی ہونے پر اصرار کرتے ہیں تو یہ بھی بتایا جائے کہ لفظ 'التابوت' میں رسم نبوی کیا تھا؟ جو ثابت نہیں، لہذا رسم عثمانی کے توقیفی ہونے کا یہی مفہوم کہ ان کی ذات تک توقیفی ہے اور یہ متفق علیہ ہے۔

ڈاکٹر حمزہ مدنی

ڈاکٹر حمزہ صاحب نے بحث کو نتیجہ خیز بناتے ہوئے یہ موقف پیش کیا کہ یہ موقف درست ثابت ہو چکا کہ کتابت (رسم) صحابہ کا عمل تھا البتہ صحابہ لکھتے ہوئے آپؐ کی قراءات کو مکمل طور پر ابتداء وقف، وصل وغیرہ کے ساتھ کتابت میں سمونے کی کوشش کرتے تھے، ہم سب اس سے زیادہ پر اصرار مناسب نہیں سمجھتے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد شفیق مدنی حفظہ اللہ

فضیلۃ الشیخ مولانا شفیق مدنی حفظہ اللہ نے یہاں یہ ایک خوب صورت اضافہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس سے پھر یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ قراءت میں اصل تلفظ ہے رسم نہیں ہے اور رسم کو ممکنہ حد تک تلفظ کے محفوظ کرنے کا متبادل ذریعہ بنایا گیا ہے یعنی وقف وصل ابتداء وغیرہ کی ساری گفتگو تو قراءۃ اور تلفظ کی ہے لہذا اصل تلفظ اور قراءۃ ہے، اصل رسم الخط نہیں ہے۔

حاصل گفتگو

آخر میں اس پوری مبحث کا ایک اتفاقی خلاصہ یوں نکالا گیا کہ کتابتِ مصحف رسم نبوی نہیں ہے بلکہ اہل قرآن صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تیار کردہ ہے البتہ اس میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ نبی گرامی قدر صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے وقف، وصل اور ابتداء کو حتی المقدور اس کتابت میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔

(نماز عصر کے بعد باہر سے آنے والے مہمانان گرامی کو پر تکلف کھانا کھلایا گیا)

علم اختلاف الحدیث کا روشن پہلو

جمع متونِ حدیث کے تدوینی مراحل اور انضمام جزئیات کی صورت

ڈاکٹر ملک کامران طاہر[1]

حدیث خبر واحد ہو یا متواتر، دونوں صورتوں میں نبیؐ کے قول و فعل اور تقریر کی خبر صحابی ہی دیتا ہے، اس لئے فنی طور پر کتب حدیث میں روایات کی گنتی یا معیار کی انتہا صحابی رسولؐ پر مبنی ہوتی ہے۔ قرآن کریم تو کلام الٰہی ہے جبکہ احادیث کی اصل نسبت رسول کریم ﷺ کی طرف ہوتی ہے اگرچہ وہ نسبت کے معصوم ہونے کے ناطے مراد الٰہی کہلاتی ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے نبی کریمؐ کے بارے میں جو خبریں دیں، ان کا ثبوت ان طرق پر مبنی ہوتا تھا جو روایات کی صورت صحابی تک پہنچتی تھیں۔ امام شافعیؒ کی 'کتاب اختلاف الحدیث' معروف ہے انہوں نے مختلف روایات حدیث کو جمع و تطبیق کے ذریعے زندگی میں پیش آنے والے واقعات کے گواہان کی طرح قرار دیا ہے کہ متعدد خبر دینے والوں کے ذریعے کس طرح واقعات کی تکمیل ہوتی ہے؟ دورِ تقلید میں عام لوگوں کی تقلید کا دار و مدار عقیدتِ امام پر ہوتا ہے، اس لئے انہیں دھڑوں میں تقسیم کرنے والوں نے انہی روایات میں سے اپنے مطلب کی روایت کو اختیار کر کے تقلید کا جواز بنالیا ہے۔ اس لئے اب یہ موضوع 'اختلاف الحدیث' کہلاتا ہے حالانکہ روایات کا تعدد عوام کے لیے فرقہ پرستی کی بجائے واقعات کی تکمیل کا اہم ذریعہ ہوتا ہے اور یہ علم 'اختلاف الحدیث' کا روشن پہلو ہے۔ مقالہ نگار نے اسی روشن پہلو کو اجاگر کرنے کے لئے جمع متون حدیث کے تدوینی مراحل اور انضمام جزئیات کی صورت محدثین کی کاوشوں کا احاطہ کرنے کی تحقیقی محنت کی ہے تاکہ اس خدمتِ حدیث کو فرقہ بندی کی بجائے وحدتِ ملت کا اہم ذریعہ بنایا جاسکے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ آمین ثم آمین (محدث)

سنت رسول ﷺ کے تعین کے لیے 'محدثین' نے فن حدیث کا ایک خاص اسلوب اختیار کیا ہے، یہ کہ عموماً وہ تمام احادیث اور روایاتِ حدیث اکٹھی کر لیتے ہیں جو کسی ہدایت نبوی ﷺ یا آپ کے زمانے میں پیش آنے والے مخصوص واقعہ سے متعلق ہوتی ہیں۔ یہ کام بالکل اسی طرح ہوتا ہے جیسے تفتیشی پولیس یا عدالت

[1] فاضل جامعہ لاہور الاسلامیہ اور اسسٹنٹ پروفیسر، دی یونیورسٹی آف لاہور

کسی وقوعہ جرم یا نزاع کی تصدیق یا نوعیت معلوم کرنے کے لیے متعدد گواہان کے بیان سے کام لیتی ہے۔ نصوص سے استدلال اور فہم کے اختلاف سے نظریات کا مختلف ہونا لازمی امر ہے مسلمانوں کے درمیان اسلامی احکام میں مختلف آراء اور رویے پائے جاتے ہیں بسا اوقات یہ نظریات ایک دوسرے کی ضد دکھائی دیتے ہیں ان اختلافات کی ایک نوعیت متون حدیث میں الفاظ کی کمی وزیادتی ہے جس کی وجہ سے استنباط مسائل میں حکم مختلف ہو جاتا ہے۔ کسی حدیث کی عبارت یا واقعہ کی پوری تصویر موازنہ کے لیے اگر سامنے نہ ہو گی اس وقت تک اخذ مسائل میں درست سمت اور نتیجہ محال ہو گا اسی ضرورت کو سمجھتے ہوئے محدثین نے متون کو ایک جگہ جمع کرنے کی مختلف ادوار میں اپنی اپنی بساط کے مطابق کوشش کی اور اہل تحقیق وعلمائے امت کے لیے مکمل نصوص ترتیب دیں جس سے استخراج مسائل واحکام آسان ہوا۔ لہٰذا محدثین نے مختلف ادوار میں احادیث رسولؐ کے متون کو اکٹھا کیا جس میں پہلا دور اسناد کے ساتھ متون کی کتب لکھی گئیں، دوسرے مرحلہ میں اسناد کے بغیر متون ایک جگہ پہ جمع کئے گئے۔ تیسرے مرحلے میں متون کی جزئیات کو محدود پیمانے پہ یکجا کیا گیا، چوتھے اور آخری مرحلے میں ایک واقعہ یا حدیث کے تمام تر پہلوؤں کو اکٹھا کر کے واقعاتی ترتیب کو عمل میں لایا گیا۔ زیر نظر تحریر میں جمع المتون کے مذکورہ مراحل کا اختصاصی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

جمع المتون کی اہمیت وضرورت:

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (۲۴۱ھ) فرماتے ہیں:

> الحديث إذا لم تجمع طرقه لم تفهمه والحديث يفسر بعضه بعضا [1]
>
> "جب تک حدیث کے تمام طرق جمع نہ ہوں اسے سمجھا نہیں جاسکتا کیونکہ حدیث کا ایک حصہ دوسرے کی تفسیر کرتا ہے۔"

امام المدینی رحمۃ اللہ علیہ (۲۳۴ھ) فرماتے ہیں:

> الباب إذا لم تجمع طرقه، لم يتبين خطؤه [2]
>
> "کسی موضوع کے جب تک طرق اکٹھے نہ ہوں تو اس کے پہلو واضح نہیں ہوتے۔"

---

[1] الجامع لاخلاق الراوی و آداب السامع ،(الرياض: مكتبه المعارف) :۲: ۲۱۲

[2] مقدمة ابن الصلاح بتحقيق نورالدين عتر ،(بيروت: دار الفكر ، ١٤٠٦ھ) ،ص:۹۱

ابراہیم بن سعید الجوہری رحمۃ اللہ علیہ (۲۴۴ھ) فرماتے ہیں:

كل حديث لا يكون عندي من مائة وجه فانا فيه يتيم [1].

"جو حدیث سو وجوہ سے میرے پاس نہ ہو تو (میں سمجھتا ہوں کہ) میں اس میں یتیم ہوں"

ابو حاتم الرازی رحمۃ اللہ علیہ (۲۷۷ھ) فرماتے ہیں:

لو لم يكتب الحديث من ستين وجها ما عقلناه [2].

"جب تک کوئی حدیث ساٹھ وجوہ سے نہ لکھی جائے ہم اسے نہیں سمجھ سکتے۔"

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

ما رأيت على وجه الأرض من يحسن صناعة السنن ويحفظ ألفاظها الصحاح ويقوم بزيادة كل لفظةزاد ها في الخبر ثقة حتى كأن السنن كلها بين عينيه إلا محمد بن إسحاق بن خزيمة فقط [3]

"میں نے محمد بن اسحاق بن خزیمہ ؒ کے علاوہ روئے زمین پہ کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو سنن کے فن کو اچھا کرتا ہو اور صحاح کے الفاظ کو یاد رکھتا ہو، اور ہر اس لفظ کی زیادتی جو ایک ثقہ راوی نے خبر میں کی ہے اسے اس طرح قائم کرتا ہو گویا سب کی سب سنن اس کی آنکھوں کے سامنے ہو"

ابراہیم الحربی رحمۃ اللہ علیہ (۲۸۵ھ) کہتے ہیں:

"میں نے المسیبی ؒ سے سنا انہوں نے کہا ہم نے واقدی ؒ کو مدینہ میں مسجد نبوی میں ستون سے ٹیک لگائے درس دیتے دیکھا۔ ہم نے انہیں کہا: آپ کس چیز کا درس دے رہے ہیں؟ تو انہوں نے کہا: 'مغازی' کے ایک جز کا۔ ہم نے انہیں کہا کاش! آپ ہمیں ہر راوی کی علیحدہ حدیث بیان کریں! تو انہوں نے کہا طویل ہو جائے گا۔ ہم نے انہیں کہا ہم راضی ہیں۔ وہ ہم سے ایک جمعہ غائب رہے پھر ہمارے پاس اکیس جلدیں لائے برمکی کی حدیث میں سو جلدوں کا ذکر ہے۔ تو ہم نے انہیں کہا آپ

---

۱ تذكرة الحفاظ ، ۷٦،۲

۲ فتح المغيث ۲۹۹،۳

۳ سير اعلام النبلاء ، ۲۲۹،۱۱

ہمیں پہلے معاملے کی طرف ہی لوٹائیں"[1]

امام شاطبی رحمہ اللہ (۷۹۰ھ) کہتے ہیں:

ومدار الغلط في هذا الفصل إنما هو على حرف واحد، وهو الجهل بمقاصد الشرع، وعدم ضم أطرافه بعضها ببعض،فإن مأخذ الأدلة عند الأئمة الراسخين إنما هو على أن تؤخذ الشريعة كالصورة الواحدة بحسب ما ثبت من كلياتها وجزئياتها المرتبة عليها[2].

"اس فصل میں غلطی کا دار و مدار ایک چیز پر ہے اور وہ یہ ہے کہ مقاصد شریعہ سے جہالت اور شرع کے مختلف اطراف کو ایک دوسرے سے نہ ملانا۔ آئمہ راسخین کے ہاں ماخذ ادلہ یہ ہیں کہ شریعت کو کلیات وجزئیات کے ثبوت کے ساتھ ایک ہی صورت میں لیا جائے"

خطیب بغدادی رحمہ اللہ (۴۶۳ھ) فرماتے ہیں:

قل ما يتمهر في علم الحديث ويقف على غوامضه ويستثير الخفي من فوائده إلا من جمع متفرقه وألف متشتته وضم بعضه إلى بعض واشتغل بتصنيف أبوابه وترتيب أصنافه[3].

"ایسے لوگ بہت کم ہیں جو علم حدیث میں مہارت رکھتے ہوں اور اس کے غموض سے واقف ہوں اور اس کے فوائد کے مخفی پہلوؤں کو ظاہر کر سکتے ہوں مگر (یہ وہ ہی کر سکتا ہے) جو حدیث کے متفرقات کو جمع کر لے اور مختلف حصوں کو لکھ لے اور اس کے ایک کو دوسرے میں ضم کر دے اور اس کے ابواب کی تصنیف اور اصناف کی ترتیب میں مشغول ہو جائے"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:

أن بعض الرواة يختصر الحديث وأن المتعين على من يتكلم على الأحاديث أن

---

۱ سیر اعلام النبلاء ،۸، ۱۶۱

۲ الاعتصام لشاطبی : ۳۱۱

۳ الجامع لاخلاق الراوی و آداب السامع لخطیب البغدادی ،۲، ۲۸۰

يجمع طرقها ثم يجمع ألفاظ المتون إذا صحت الطرق ويشرحها على أنه حديث واحد فإن الحديث أولى ما فسر بالحديث[1] .

"بعض رواۃ، حدیث کا اختصار کر دیتے ہیں اور بے شک احادیث پر گفتگو کرنے والے پر متعین بات یہی ہے کہ وہ ان کے طرق جمع کرے، متون کے الفاظ کو یکجا کرے اور جب طرق کی تصحیح ہو جائے تو اسے ایک ہی حدیث کے طور پر اسکی تشریح کرے۔ بے شک حدیث کی بہترین تفسیر وہ ہے جو حدیث سے کی جائے۔"

متون الحدیث کے تدوینی مراحل

متون حدیث کی تدوین کے ادوار کو چار مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا مرحلہ: مع اسناد متون کا اندراج:

ان کی مثال معروف کتب احادیث بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی، مسانید و مصنفات وغیرہ ہیں جن میں محدثین نے مکررات کو الگ متن اور سند کے ساتھ اپنے اپنے مقام پر ذکر کیا ہے۔

دوسرا مرحلہ: مختلف کتب احادیث کے متون کو ایک جگہ جمع کرنا:

دوسرا مرحلہ احادیث کے متون کو ایک جگہ جمع کرنا تھا۔ جس میں مرتبین امہات الکتب میں وارد شدہ احادیث کے متون کو ایک ہی جگہ جمع کر دیتے ہیں ان میں جمع الجوامع کی کتب شامل ہیں۔

⦿ جمع الجوامع:

⦿ کتاب رزین:

رزین بن معاویہ عبدریؒ (۵۳۵ھ) کے مختلف کتب کی احادیث کو ایک جگہ جمع کرنے کی یہ ایک اہم کاوش تھی اس میں امام صاحب نے کتب ستہ: صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داود، جامع ترمذی، سنن نسائی اور اس کے علاوہ موطا امام مالک کی روایات کو جمع کیا اور اختصار کرتے ہوئے مکرر احادیث کو حذف کر دیا، پھر انہیں فقہی ابواب میں ترتیب دیا۔

---

1 فتح الباری ،(بیروت :دار المعرفة ، ١٣٧٩ھ) :٦/ ٤٧٥

⊙ جامع الاصول فی احادیث الرسول:

یہ کتاب ابو سعادات مبارک بن محمد شیبانی المعروف بابن اثیر الجزری ؒ(۶۰۶ھ) کی ہے، جو ۱۵ مجلدات پر مشتمل ہے، جس میں ۹۵۲۳ احادیث جمع کی گئی ہیں۔ یہ کتاب دراصل ابو الحسن رزین بن معاویہ بن عمار عبدری (۵۳۵ھ) کی کتاب کی تہذیب ہے۔

⊙ جامع السنن والمسانید:

یہ کتاب حافظ اسمٰعیل بن کثیر قرشی دمشقیؒ(م ۷۷۴ھ) کا مایہ ناز علمی شاہکار ہے، اس میں حدیث کی دس بڑی کتب: مسند احمد، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داود، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، معجم کبیر طبرانی، مسند بزار اور مسند ابی یعلیٰ کی احادیث کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے، بسا اوقات ان کتب کے علاوہ دیگر کتب کی احادیث بھی وارد کردیتے ہیں جن میں حلیۃ الاولیاء لابی نعیمؒ، کتاب الاصول لابن ابی الدنیاؒ، اسد الغابہ لابن الاثیرؒ اور الاصابہ لابن حجرؒ شامل ہیں مسند کی طرز پر جمع شدہ اس عظیم کتاب کی حافظ ابن کثیرؒ کی تیار کردہ جلدوں کی تعداد ۳۷ اور اضافہ شدہ جلدوں کی تعداد تین ہے، یہ کل جلدیں ۴۰ بنتی ہیں۔

⊙ الجامع الکبیر:

یہ کتاب بھی امام سیوطی کی مرتب کردہ ہے اس کی احادیث کی تعداد ۴۶۶۲۴ ہے اور اس کتاب میں انہوں نے نبی ﷺ کی قولی و فعلی احادیث کو بالاستیعاب جمع کرنے کی انتھک کوشش کی ہے۔ ان کی یہ کتاب تجمیع احادیث کا ایک عظیم شاہکار ہے۔

⊙ الجامع الصغیر :

یہ کتاب حافظ جلال الدین ابو الفضل بن ابی بکر بن محمد بن سابق سیوطیؒ(۹۱۱ھ) کا ۳ مجلدات اور ۱۴۶۶۲ احادیث پر مشتمل مجموعہ ہے۔ متون احادیث میں یہ ایک جامع کتاب کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

⊙ كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال:

علامہ علی بن حسام الدین عبد الملک بن قاضی خان متقی ہندیؒ(۹۷۵ھ) نے اس کتاب کو مرتب کیا یہ ۱۸ مجلدات پر مشتمل ہے یہ کتاب دراصل امام سیوطی کی تین کتب الجامع الکبیر، الجامع الصغیر اور زیادۃ الجامع کا مجموعہ ہے جسے مؤلف نے فقہی ترتیب پر بغیر کسی کمی بیشی کے مرتب کیا ہے۔

تیسرا مرحلہ: متون کی محدود واقعاتی ترتیب:

متون کے ایک جگہ جمع کرنے کی تیسری صورت یہ تھی کہ متون کی جزئیات وزوائد جو کہ مختلف کتب میں مختلف مقامات پر بکھرے پڑے ہیں انہیں ایک متن میں سیاق وسباق کا خیال رکھتے ہوئے جمع کر دینا ہے۔ اس کی افادیت کو سمجھا گیا اور محدثین اس صورت کو محدود صورت میں دائرہ عمل میں لائے۔

علامہ البانیؒ (۱۴۲۰ھ) ایک حدیث کے متن کو ذکر کرتے ہیں:

إن ملك الموت كان يأتي الناس عيانا، حتى أتى موسى عليه السلام، فقال له: أجب ربك، قال: فلطم موسى عليه السلام، عين ملك الموت ففقأها، فرجع الملك إلى الله تعالى، فقال: [يا رب!] إنك أرسلتني إلى عبد لك لايريد الموت، وقد فقأ عيني، [ولولا كرامته عليك لشققت عليه] . قال: فرد الله إليه عينه، وقال: ارجع إلى عبدي فقل: الحياة تريد؟ فإن كنت تريد الحياة؛ فضع يدك على متن ثور، فما توارت يدك من شعرة؛ فإنك تعيش بها سنة، قال: [أي رب!] ثم مه؟ قال: ثم تموت، قال: فالآن من قريب، رب! أمتني من الأرض المقدسة رمية بحجر! [قال: فشمه شمة فقبض روحه، قال: فجاء بعد ذلك إلى الناس خفيا] قال رسول الله – صلى الله عليه وسلم–والله! لو أني عنده لأريتكم قبره إلى جانب الطريق عند (وفي طريق: تحت) الكثيب الأحمر[1] .

اس کے ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

هذا الحديث من الأحاديث الصحيحة المشهورة التي أخرجها الشيخان من طرق عن أبي هريرة رضي الله عنه وتلقته الأمة بالقبول، وقد جمعت ألفاظها والزيادات التي وقعت فيهاوسقتها لك سياقا واحدا كما ترى؛ لتأخذالقصة كاملة بجميع فوائدها المتفرقة في بطون مصادرها، الأمر الذي يساعدك على فهمها فهما

1 سلسلة الاحاديث الصحيحة للالبانی(۸۲٦/۷)، رقم الحدیث: ۳۲۷۹

صحيحا، لا إشكال فيه ولا شبهة، فتسلم لقول رسول الله- صلى الله عليه وسلم تسليما. والطرق عنه ثلاثة:الأولى: عن طاوس عن أبي هريرة: أخرجه الشيخان وغيرهما، وعندهما الزيادة الثالثة، وهي الطريق المشار إليهافي آخر الحديث.

الثانية: عن همام عنه. أخرجاه أيضا وغيرهما، والسياق لمسلم، وهو أتم.

الثالثة: عن عمار بن أبي عمار قال: سمعت أبا هريرة يقول... أخرجه أحمد، وابن جرير الطبري في 'التاريخ '، وإسناده صحيح،وهو الطريق المشار إليه في أول الحديث، وفيه كل الزيادات إلا الثالثة [1].

"یہ مشہور احادیث میں سے ایک ہے جسے شیخین نے حضرت ابو ہریرہؓ کے طریق سے تخریج کیا ہے اور اسے امت کے ہاں تلقی بالقبول حاصل ہے۔ میں نے اس کے الفاظ اور اس میں پائے جانے والی زیادات کو اکٹھا کر کے ایک ہی سیاق میں انہیں ترتیب دیدیا ہے جس طرح کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ تاکہ آپ کو اپنے تمام فوائد کے ساتھ مکمل قصہ ایک مقام پر مل سکے جو مصادر میں مختلف جگہوں پر بکھرا ہوا تھا۔ یہ ایسا معاملہ ہے کہ جو تجھے تیری راست تفہیم میں معاون ثابت ہو گا اور کسی قسم کا اشکال وشبہہ نہیں ہو گا۔ پس تو رسول اللہ ﷺ کی بات پہ راضی ہو جا۔

مذکورہ روایت میں تین طرق ہیں پہلا یہ کہ ابی هريرة عن طاؤس جو کہ شیخین وغیرہما نے تخریج کی ہے اور ان کے نزدیک تیسری زیادت جس کی طرف حدیث کے آخر میں اشارہ کیا گیا ہے دوسرا طریق عن أبي هريرة عن همام ہے اسے بھی شیخین وغیرہما نے تخریج کیا ہے جبکہ سیاق مسلم کا ہے اور وہ مکمل ہے۔

تیسرا طریق عن عمار بن ابی عماره قال سمعت اباهريرة يقول .... سے ہے اسے احمد نے (مسند میں) اور ابن جریر الطبری نے اپنی تاریخ میں تخریج کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ پہلی حدیث میں اسی سند کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس میں تیسرے پہرے کے علاوہ سب زیادات ہیں"

1 سلسلة الاحاديث الصحيحة للالبانى (٨٢٦/٧)، رقم الحديث: ٣٢٧٩

اس مرحلہ میں لکھی جانے والی کتب:

⊙ الجمع بين الصحيحين:

یہ کتاب ابو عبد اللہ محمد بن ابی نصر فتوح ابن عبد اللہ الحمیدیؒ کی کاوش ہے جو اندلس کے جزیرہ میوسقہ کے اندر (۴۱۱ھ) میں پیدا ہوئے[1]۔ میں امام صاحب نے محمد بن اسماعیل البخاری (۲۵۶ھ) اور مسلم بن حجاج (۲۶۱ھ) کی تالیفات کی روایات کو جمع کیا ہے امام صاحب نے اس کتاب میں صحیحین کی مشترک روایات کے متون کو متن واحد میں اختیاری ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ اس کتاب کے منہج سے متعلق محقق علی حسین لکھتے ہیں:

ومنهاج أبی عبدالله فی جمع المتون المتقاربة يحذف كثيرا من الأحاديث المكروة أو المتقاربة الألفاظ ،التی لم ير فيها زيادة تستحق التنبيه كما جمله هذا الملك على أن يجمع أحاديث طويلة جدا فی مكان واحد: كحديث السقيفة، و حديث اعتزال النبی صلی الله عليه وسلم نساء، وحديث جابر والجمل ،وحديث عائشة في الحج والحيضة،وحديث الإفك، وحديث الهجرة وغيرها مما شغل كل حديث منها بضع صفحات.وإذا كان الغرض الرئيس للكتاب والمؤلف جمع الصحيحين و ترتيبهما، وهذا عمل ليس باليسير،وفيه جهد كبير في تجميع الروايات و ترتيبها وعرضها إلا أن للحميدی فی الكتاب عملا وجهودا كثيرة ولم يتوقف عند ما ذكرناه: فهويورد رواية للحديث ثم يقارنها بسائر الروايات ويبين ما بينها من زيادات أو اختلافات أو مشابهة فی بعض عبارات[2].

"ابو عبد اللہ کا متقارب متون کو جمع کرنے میں یہ منہج رہا ہے کہ انہوں نے احادیث کے اکثر مکررات اور متقارب الفاظ جنہیں وہ تنبیہ میں زیادت تصور نہیں کرتے انہیں حذف کر دیا ہے، جس طرح کہ انہوں نے خوبصورتی سے اس کام کو سرانجام دیا ہے کہ طویل تر احادیث کو ایک جگہ پر جمع کر دیا مثلا:

۱ معجم البلدان للحموی ،(بيروت: دار صادر،١٩٩٥ء)،٥، ٢٤٦

۲ مقدمة للمحقق الدكتور علی حسين البواب :١٤-١٥

حديث السقيفة ، حديث اعتزال النبی ﷺ نساء، حديث جابر والجمل ، حديث عائشة فی الحج و الحيضة ، حديث الافک اور ہجرت وغیرہ ان میں ہر حدیث چند صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب لکھنے کی بنیادی غرض یہی تھی جس کے لیے مولف نے صحیحین کو جمع کیا اور ترتیب دیا۔ یہ کام آسان نہ تھا روایات کو جمع کرنا، ترتیب دینا اور پیش کرنا ایک بڑی کاوش تھی مگر حمیدی نے یہ کام اس کتاب میں بڑی جدوجہد کے ساتھ ذرا توقف نہیں برتا۔ وہ حدیث کی روایت لاتے ہیں پھر تمام روایات کا مقارنہ کرتے ہیں اس کی بعض عبارتوں میں زیادات، اختلافات اور مشابہات کو بیان کرتے دیتے ہیں"

متون کی واقعاتی اختیاری ترتیب کی یہ پہلی کاوش تھی جو بخاری و مسلم کی احادیث کے متون کو متن واحد میں جمع کیا گیا:

مثال:

عن عبد الله بن أبي قتادة عن أبيه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا أقيمت الصلاة فلا تقوموا حتى تروني[1] وأخرجه مسلم أيضا من حديث أبي سلمة عن أبي قتادة بمثله وفي رواية إسحاق بن إبراهيم: حتى تروني قد خرجت[2] وهو عند البخاري[3] في حديث شيبان وعلي بن المبارك: وعليكم السكينة[4].

"عبد اللہ بن ابی قتادہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب نماز کے لیے اقامت کہی جائے تو اس وقت تک کھڑے نہ ہوا کرو جب تک مجھے نہ دیکھ لو اسی طرح کے الفاظ مسلم نے ابو سلمہ عن ابی قتادہ روایت کیے ہیں اور اسحاق بن

---

١ صحيح البخارى ،كتاب الاذان ، باب متى يقوم الناس اذاراوالامام عند الاقامه : ٦٣٧

٢ صحيح مسلم،كتاب المساجد ، باب متى يقوم الناس للصلاة رقم الحديث :٦٠٤

٣ صحيح البخارى كتاب الجمعة ، باب المشى الى الجمعه ، رقم الحديث : ٩٠٩

٤ الجمع بين الصحيحين للحميدى ،١، ٤٥٤

ابراہیم کی روایت میں ہے حتی کہ مجھے نکلتا دیکھ لو۔ اور بخاری میں شیبان اور علی بن مبارک کی حدیث میں ہے: اور تم سکون کو لازم پکڑو"

مذکورہ بالا کتاب میں امام صاحب نے صرف وہ احادیث نقل کی ہیں جس میں بخاری و مسلم کی روایات متفق علیہ تھیں ان کے متون کے جمع کے وقت جزئیات کی ترتیب کا خیال رکھا ہے، لیکن متون حدیث کے جمع کے وقت ساتھ ساتھ بخاری و مسلم کے جز کی نشاندہی بھی کر دیتے ہیں گویا یہ متن واحد میں دو کتابوں کی مشترکہ حدیث کے مجمع کا ابتدائی کام تھا۔

⊙ اقضية الرسول ﷺ:

یہ کتاب ابو عبد اللہ محمد بن فرج المالکی المعروف ابن الطلاع (۴۹۷ھ) کی ہے جو محمد ضیاء الرحمان اعظمی کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ قاہرہ سے چھپ چکی ہے۔ اس میں مرتب نے واقعہ نگاری کرتے ہوئے نبی ﷺ کے فیصلوں کے بارے مختلف متون کو ان کی جزئیات کے ادغام کے ساتھ ایک جگہ اکٹھا کر دیا ہے اور یہ اس نوعیت کا پہلا کام تھا، لیکن واقعات کی جزئیات مکمل نظر نہیں آتیں۔ مصنف نے اس کتاب میں ایک روایت کے مختلف کتب میں منتشر متون کو ایک ہی متن میں جمع کر دیا ہے اگرچہ اس کی ترتیب بھی واقعہ نگاری کے ساتھ ہے، لیکن مصنف نے اس میں دوران ترتیب جزئیات و زوائد کی ترتیب کاری میں مظنات متون کو بھی ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے۔

مثال:

حکم ﷺ في الثيب کے عنوان کے تحت یہ روایت نقل کرتے ہیں:

يزوجها أبوها بغير رضاهافي الموطأ والبخاري ومسلم والنسائي ومصنف عبد الرزاق عن خنساء ابنة خذام الأنصارية: أن أباها زوجها وهي ثيب، فكرهت ذلك فأتت رسول الله صلى الله عليه وسلم فرد نكاحه»[1] ووقع في مصنف عبد

---

1 صحیح بخاری ، کتاب النکاح ، باب اذازوج ابنته وهی کارهة ، :۵۱۳۸- الموطا، کتاب النکاح باب جامع مالا یجوز النکاح : ۱۹۵۹-سنن نسائی ، الثیب یزوجها ابوها وهی کارهة: ۳۲۶۸- مصنف عبدالرزاق : ۱۰۳۰۷

الرزاق أنها تزوجت بعده أبا لبابة الأنصاري. وكنية خِذَامٍ: أبو وريعة [1] ووقع أيضا فيه عن مهاجر بن عكرمة: أن بكرا أنكحها أبوها - وهي كارهة - فجاءت النبي صلى الله عليه وسلم فرد إليها أمرها [2]. وحدثنا ابن جريج عن أيوب عن عكرمة، وعن يحيى بن أبي كثير: أن ثيبا وبكرا أنكحهما أبوهما - وهما كارهتان - فجاءتا إلى النبي صلى الله عليه وسلم فرد نكاحهما [3] وعن عبد الله بن بريدة أنه قال: جاءت امرأة بكر إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقالت: يا رسول الله إن أبي زوجني ابن أخ له يرفع خسيسته بي، ولم يستأمرني فهل لي في نفسي أمر؟ فقال لها رسول الله صلى الله عليه وسلم: «نعم».فقالت له: ما كنت لأرد على أبي شيئا صنعه، ولكن أحببت أن تعلم النساء أن لهن في أنفسهن أمرا أم لا وفيه أيضا وفي الواضحة: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا أراد أن يزوج امرأة من بناته جاء إلى الخدر فقال: «إن فلانا يخطب فلانة» . فإن حركت الخدر لم يزوجها. وقال في الواضحة: فإن طعنت في الستر بأصبعيها لم يزوجها، وإن سكتت زوجها [4]

"موطا، بخاری، مسلم، نسائی اور مصنف عبد الرزاق میں خنساء بنت خذام انصاریہ سے روایت ہے کہ اس کے باپ نے اس کی شادی کر دی اور وہ ثیبہ تھی، اس نے اسے ناپسند کیا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئی تو آپ ﷺ نے اس کا نکاح فسخ کر دیا۔ مصنف عبد الرزاق ہی میں ہے کہ اس نے بعد میں ابو لبابہ انصاری سے شادی کر لی۔ خذام کی کنیت ابو وریعہ تھی۔ اسی طرح مہاجر بن عکرمہ سے روایت ہے کہ ایک کنواری لڑکی کے باپ نے اس کی شادی کر دی اور وہ اس کو ناپسند کرتی تھی تو وہ نبی ﷺ کے پاس آئی تو آپؐ نے اس معاملہ کا اختیار اس کے سپرد کر دیا۔ ہمیں ابن جریج نے ایوب

---

۱ مصنف عبدالرزاق : ۱۰۳۰۷

۲ ایضا، :۱۰۳۰۱

۳ ایضاً، :۱۰۳۰٦

۴ مصنف عبدالرزاق : ۱۰۲۷۷، حمیدی الجمع بین الصحیحین: ٦١

سے انہوں نے عکرمہ سے، انہوں نے یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کی ہے کہ ایک ثیبہ اور کنواری دونوں کا نکاح ان کے باپوں نے ان کی رضامندی کے بغیر کر دیا تو وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں آپ ﷺ نے ان دونوں کو نکاح میں اختیار دیدیا۔ عبد اللہ بن بریدہ سے روایت ہے کہ ایک کنواری عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اس نے کہا اللہ کے رسول ﷺ! میرے باپ نے میری شادی اپنے بھتیجے سے کر دی ہے اور وہ میری وجہ سے عزت پانا چاہتا ہے یعنی وہ لالچی ہے۔ اور مجھ سے مشورہ بھی نہیں کیا تو کیا میرے لیے کوئی راہ ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں تو اس نے کہا میرے باپ نے جو کر دیا میں اس کو رد نہیں کرنا چاہتی، لیکن میں نے پسند کیا کہ عورتیں جان لیں ان کے ہاتھ میں اختیار ہے یا نہیں (اسی طرح اور ہے کہ) بے شک رسول اللہ ﷺ جب اپنی بیٹیوں میں سے کسی کی شادی کا ارادہ کرتے تو اس کے خیمے کی طرف آتے اور فرماتے بے شک فلاں نے فلانہ کو نکاح کا پیغام بھیجا ہے پس اگر وہ خیمہ حرکت کرتا تو اس کی شادی نہ کرتے۔ (اور اسی طرح یہ بھی ہے کہ) اگر وہ اپنی انگلیوں سے پردہ میں کچوکہ لگا دیتی تو اسکی شادی نہ کرتے اور اگر خاموش رہتی تو شادی کر دیے"

چوتھا مرحلہ: انضمام جزئیات اور متون کی اختیاری ترتیب

اس مرحلہ میں کسی ایک حدیث کو بنیاد بناتے ہوئے اس سے متعلق دیگر متون اور زوائد کو زمانی اور سیاق و سباق کی ترتیب سے اپنے اپنے محل پہ ضم کرنا ہے۔ اس صورت میں متون کی جزئیات کو اجتہادی ترتیب کے ساتھ ایک متن میں جمع کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ ایک واقعہ یا حدیث کی تمام جزئیات جو مختلف رواۃ نے الگ الگ بیان کی ہیں اپنے سیاق و سباق کے ساتھ ایک جگہ پر جمع ہو جاتی ہیں جس سے درج شدہ تمام پہلوؤں کو یکجا کر کے ان سے احکام و مسائل میں درست استنباط کیا جا سکتا ہے۔

⊙ مختصر صحیح البخاری للالبانی:

امام البانیؒ (۱۴۲۰ھ) وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے واقعاتی اجتہادی ترتیب کو مشکل صورت میں اپنایا اور عملی طور پر صحیح بخاری کا اختصار کرتے ہوئے بخاری کی مکررات کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ ایک روایت جو کہ بخاری کے مختلف ابواب میں مکرر آ چکی تھی اسے حذف کرنے کی بجائے ایک حدیث کو بنیاد بناتے ہوئے دیگر احادیث کے زوائد کو بنیادی حدیث میں درج کر دیا اور متن بناتے ہوئے اختیاری حد تک واقعاتی ترتیب کو ملحوظ

رکھا۔ متن واحد میں ایک سے زیادہ جزئیات رکھنے والی احادیث کو مکمل شکل دینا کہ اس کا سیاق وسباق اور فی نفسہ عبارت پوری طرح متشکل ہو جائے۔ علامہ البانیؒ اپنے اس کام کے متعلق لکھتے ہیں:

حذفت أسانيد أحاديثه كلها، ولم أبق منها إلا اسم الصحابي راوي الحديث عن النبي – صلى الله عليه وسلم – مباشرة، إلا ما لا بد منه من الرواة الذين قد تدور القصة عليهم، ولا تتم الرواية إلا بذكرهم ممن دون الصحابي. من المعلوم عند العارفين بـ صحيح البخاري أنه يكرر الحديث في كتابه ويذكره في مواطن عديدة وكتب وأبواب مختلفة، وبروايات متعددة، ومن أكثر من طريق واحدة أحيانا، مطولا تارة، ومختصرا أخرى، وبناء عليه فإنني أختار من الروايات المكررة أتمها وأكملها، وأجعلها هي الأصل في 'المختصر'، ولكنني لا أعرض عن الروايات الأخرى، بل أجري عليها دراسة خاصة، باحثا فيها عما إذا كان في شيء منها فائدة أو زيادة ما لم ترد في الرواية المختارة، فآخذها وأضمها إلى الأصل. ثم إن الضم المذكور يكون على صورة من صورتين:

الأولى: إذا كانت الزيادة تقبل الانضمام إلى مكانها اللائق بها من الأصل، وتنسجم مع السباق والسياق منه بحيث لا يشعر القارئ الأديب بأنها زيادة، وضعتها في مكانها بين قوسين معقوفين[1]

"میں نے اس کی احادیث کی تمام اسناد حذف کر دیں صرف صحابی کا نام باقی رکھا ہے جس نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے ۔ہاں وہ رواۃ کہ جن پر قصہ کا دار و مدار تھا یا کا نام لیے بغیر محض صحابی کے نام سے روایت مکمل نہیں ہوتی تھی ان کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

صحیح بخاری کو جاننے والوں کو معلوم ہے کہ امام بخاریؒ اپنی صحیح میں ایک حدیث کو مکرر بھی لاتے ہیں اور اس کا ذکر متعدد جگہوں پر مختلف روایات کے ساتھ مختلف کتب و ابواب میں کرتے ہیں اور اکثر طور پر ایک ہی سند کے ساتھ ہوتی ہیں کبھی تو مطول اور کبھی مختصر۔ اسی کو بنیاد بناتے ہوئے میں نے

1 مختصر صحيح البخارى للألباني:١/٧

مکرر روایات میں سے اتم اور اکمل روایات کا انتخاب کیا ہے اور اسے میں اپنی 'مختصر' میں بنیادی روایت بناؤں گا۔ لیکن میں دیگر روایات کو نظر انداز نہیں کروں گا بلکہ میں خاص پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے اگر اس میں کوئی مفید نکتہ ہو تو ذکر کروں گا یا پھر ایسے زائد الفاظ جو منتخب شدہ روایت میں نہ ہوں انھیں اصلی روایت میں ضم کروں گا اور یہ انضمام دو صورتوں میں ہو گا:
پہلا یہ کہ جب زیادت کے الفاظ اصلی روایات میں مناسب جگہ پر ضم ہونے کے قابل ہوں گے تو انھیں اسکے سیاق وسباق کے ساتھ اس طرح پیوست کیا جائے گا کہ ایک ادب سے آشنا قاری اس میں زیادت محسوس نہ کر پائے اور میں یہ الفاظ قوسین میں رکھوں گا"

علامہ البانیؒ کی بخاری کے اختصار میں مکررات احادیث اور زوائد کو ایک ہی متن میں حسن ترتیب کے ساتھ جمع کرنے کی مثال پیش کی جاتی ہے:

عن عائشة رضي الله عنها أم المؤمنين أنها قالت[1]: [كان][2] أول ما بدىء به رسول الله صلى الله عليه وسلم من الوحي الرؤيا الصالحة في النوم، فكان لا يرى رؤيا إلاجاءت مثل فلق الصبح، ثم حبب إليه الخلاء ، وكان يخلو بغار حراء، فيتحنث فيه وهو التعبد الليالي ذوات العدد قبل أن ينزع إلى أهله، ويتزود لذلك، ثم يرجع إلى خديجة، فيتزود لمثلها ، حتى جاءه [فجئه][3] الحق وهو في غار حراء، فجاءه الملك [فيه][4] فقال: اقرأ، قال: ما أنا بقارىء، قال: فأخذني، فغطني حتى بلغ مني الجهد، ثم أرسلني، فقال: اقرأ، قلت: ما أنا بقارىء، فأخذني فغطني الثانية، حتى بلغ مني الجهد، ثم أرسلني، فقال: اقرأ، فقلت: ما أنا بقارىء، فأخذني فغطني الثالثة، ثم أرسلني، فقال: {اقرأ باسم ربك الذي خلق. خلق الإنسان من علق.

---

۱ الصحیح البخاری، باب بدء الوحی ، رقم الحدیث : ۳

۲ ایضا، کتاب تفسیر القرآن ، باب مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَى ، رقم الحدیث : ٦

۳ الصحیح البخاری ، کتاب تفسیر القرآن ، باب ما ودعک ربک وما قلی، رقم الحدیث : ٦

۴ الصحیح البخاری ، کتاب التعبیر ، باب اول ما بدء رسول الله ﷺ، رقم الحدیث : ٦٩٨٢

اقرأ وربك الأكرم. [الذي علم بالقلم.[1]علم الإنسان ما لم يعلم} الآيات]، فرجع بها رسول الله صلى الله عليه وسلم يرجف فؤاده [ترجف بوادره][2] فدخل على خديجة بنت خويلد، فقال:زملوني زملوني، فزملوه حتى ذهب عنه الروع، فقال لخديجة: [مالي؟][3]وأخبرها الخبر [وقال:][4] لقد خشيت على نفسي، فقالت [له][5] خديجة: كلا [أبشر، فـ][6] والله ما يخزيك الله أبدا[فوالله][7]إنك لتصل الرحم [وتصدق الحديث][8]وتحمل الكل، وتكسب المعدوم، وتقري الضيف، وتعين على نوائب الحق، فانطلقت به خديجة حتى أتت به ورقة بن نوفل ابن أسد بن عبد العزى [بن قصي وهو][9] ابن عم خديجة [أخي أبيها][10] وكان امرأ قد تنصر في الجاهلية، وكان يكتب الكتاب العبراني فيكتب من الإنجيل بالعبرانية [الكتاب العربي ويكتب من الإنجيل بالعربية][11] ما شاء الله أن يكتب، وكان شيخا كبيرا قد عمي، فقالت له خديجة: يا ابن عم! اسمع من ابن أخيك، فقال له ورقة: يا ابن أخي! ماذا ترى؟ فأخبره رسول الله – صلى الله عليه وسلم – خبر ما رأى، فقال له ورقة: هذا الناموس الذي نزل الله على موسى، يا ليتني فيها

---

۱ ایضا، رقم الحدیث: ٤٩٥٣

۲ ایضا، رقم الحدیث:٦٩٨٢

۳ ایضا ، رقم الحدیث:٤٩٥٣

۴ ایضا، رقم الحدیث:٦٩٨٢

۵ ایضاً

۶ ایضا، رقم الحدیث:٤٩٥٣

۷ ایضا، رقم الحدیث :٦٩٨٢

۸ ایضاً

۹ ایضاً

۱۰ ایضا ، کتاب التعبیر ، باب اول ما بدء به رسول الله ﷺ، رقم الحدیث:٤٩٥٣

۱۱ ایضاً

جذعا، ليتني أكون حيا إذ يخرجك قومك، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم:ومخرجيهم؟ قال: نعم، لم يأت رجل قط بمثل ما جئت به إلا عودي [أوذي][1]،وإن يدركني يومك أنصرك نصرا مؤزرا، ثم لم ينشب ورقة أن توفي، وفتر الوحي، [حتى حزن النبي صلى الله عليه وسلم فيما بلغنا حزنا غدا منه مرارا كي يتردى من رؤوس شواهق الجبال، فكلما أوفى بذروة جبل لكي يلقي منه نفسه؛ تبدى له جبريل فقال: يا محمد! إنك رسول الله حقا، فيسكن لذلك جأشه، وتقر نفسه، فيرجع، فإذا طالت عليه فترة الوحي غدا لمثل ذلك، فإذا أوفى بذروة جبل؛ تبدى له جبريل فقال له مثل ذلك [الناموس][2]:صاحب السر الذي يطلعه بما يستره عن غيره[3]

"ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے انھوں نے بتلایا کہ آنحضرت ﷺ پر وحی کا ابتدائی دور سچے اور پاکیزہ خوابوں سے شروع ہوا۔ آپ ﷺ خواب میں جو کچھ دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح صحیح اور سچا ثابت ہوتا۔ پھر من جانب قدرت آپ تنہائی پسند ہوتے چلے گئے اور آپ ﷺ نے غار حرا میں خلوت نشینی اختیار فرمائی اور کئی کئی دن رات آپ وہاں مسلسل عبادت، یادالٰہی وذکر وفکر میں مشغول رہتے۔ جب تک گھر آنے کو دل نہ چاہتا توشہ ہمراہ لیے ہوئے وہاں رہتے۔ توشہ ختم ہوتا تو اہلیہ محترمہ حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لاتے اور کچھ توشہ ہمراہ لے کر پھر وہاں جا کر خلوت گزیں ہو جاتے، یہی طریقہ جاری رہا یہاں تک کہ آپ ﷺ پر حق منکشف ہو گیا[آپ غار حرا ہی میں]قیام پذیر تھے کہ اچانک حضرت جبرئیلؑ آپ کے پاس[اس میں]حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ اے محمد! پڑھو آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا، آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ فرشتے نے مجھے پکڑ کر اتنے زور سے بھینچا کہ میری طاقت جواب دے گئی، پھر مجھے چھوڑ کر کہا کہ پڑھو!، میں

---

۱ ایضاً

۲ ایضا، رقم الحديث:٦٩٨٢

۳ مختصر صحيح البخارى للألباني ، كتاب بدء الوحى ،باب كيف كان بدء الوحى(١، ١٦)رقم الحديث: ٣

نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے مجھ کو نہایت ہی زور سے بھینچا کہ مجھ کو سخت تکلیف محسوس ہوئی، پھر اس نے کہا کہ پڑھ! میں نے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے تیسری بار مجھ کو پکڑا اور بھینچا پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہنے لگا: پڑھو اپنے رب کے نام کی مدد سے جس نے پیدا کیا اور انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا، پڑھو اور آپ کا رب بہت ہی مہربانیاں کرنے والا ہے [جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا اور انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا]۔

پس یہی آیتیں آپ حضرت جبرئیلؑ سے سن کر اس حال میں غار حرا سے واپس ہوئے کہ آپ کا دل اس انوکھے واقعہ سے کانپ رہا تھا [آپ حضرت خدیجہؓ کے ہاں تشریف لائے] اور فرمایا کہ مجھے کمبل اڑھا دو، مجھے کمبل اڑھا دو۔ اہل خانہ نے آپ کو کمبل اڑھا دیا۔ جب آپ ﷺ کا ڈر جاتا رہا۔ تو آپؐ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ کو تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ سنایا اور فرمانے لگے کہ [مجھے کیا ہے؟ اور فرمایا] مجھ کو اب اپنی جان کا خوف لاحق ہے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجہؓ نے آپ کی ڈھارس بندھائی اور [آپ سے] کہا کہ آپ کا خیال صحیح نہیں ہے۔ [میں آپ کو خوشخبری دیتی ہوں] خدا کی قسم! آپ کو اللہ کبھی رسوا نہیں کرے گا، آپؐ تو اخلاق فاضلہ کے مالک ہیں، آپ تو کنبہ پرور ہیں [سچی بات کی تصدیق کرنے والے ہیں] بے کسوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مفلسوں کے لیے کماتے ہیں، مہمان نوازی میں آپ بے مثال ہیں اور مشکل وقت میں آپؐ امر حق کا ساتھ دیتے ہیں۔ ایسے اوصاف حسنہ والا انسان یوں بے وقعت ذلت و خواری کی موت نہیں پا سکتا۔ پھر مزید تسلی کے لیے حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کو ورقہ بن نوفل [بن قصی] کے پاس لے گئیں، جو ان کے چچازاد بھائی تھے اور زمانہ جاہلیت میں نصرانی مذہب اختیار کر چکے تھے اور عبرانی زبان کے کاتب تھے، چنانچہ انجیل کو بھی حسب منشائے خداوندی عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے۔ [انجیل سریانی زبان میں نازل ہوئی تھی پھر اس کا ترجمہ عبرانی زبان میں ہوا۔ ورقہ اسی کو لکھتے تھے، ایک روایت میں ہے عربی میں لکھتے تھے] وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے یہاں تک کہ ان کی بینائی بھی رخصت ہو چکی تھی۔ حضرت خدیجہؓ نے ان کے سامنے آپ کے حالات بیان کیے اور کہا کہ اے چچازاد بھائی! اپنے بھتیجے [محمد ﷺ] کی زبانی ذرا ان کی کیفیت سن لیجیے۔ وہ بولے کہ بھتیجے! آپ نے جو کچھ دیکھا ہے، اس کی تفصیل سناؤ۔ چنانچہ آپ ﷺ نے از اول تا آخر پورا واقعہ سنایا، جسے سن کر ورقہ بے اختیار ہو کر بول اٹھے کہ یہ تو وہی

ناموس[معزز رازدان فرشتہ] ہے جسے اللہ نے حضرت موسیٰؑ پر وحی دے کر بھیجا تھا۔ کاش، میں آپ کے اس عہد نبوت کے شروع ہونے پر جوان عمر ہوتا۔ کاش! میں اس وقت تک زندہ رہتا جب کہ آپ کی قوم آپ کو اس شہر سے نکال دے گی۔[اور تکلیف دیں گے] رسول کریم ﷺ نے یہ سن کر تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ لوگ مجھ کو نکال دیں گے ؟[حالانکہ میں تو ان میں صادق وامین ومقبول ہوں] ورقہ بولا ہاں یہ سب کچھ سچ ہے۔ مگر جو شخص بھی آپ کی طرح امر حق لے کر آیا لوگ اس کے دشمن ہو گئے ہیں۔ اگر مجھے آپ کی نبوت کا وہ زمانہ مل جائے تو میں آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔ مگر ورقہ کچھ دنوں کے بعد انتقال کر گئے۔ پھر کچھ عرصہ تک وحی کی آمد موقوف رہی۔ آنحضرت ﷺ کو اس کی وجہ سے اتنا غم تھا کہ آپ نے کئی مرتبہ پہاڑ کی بلند چوٹی سے اپنے آپ کو گرا دینا چاہا، لیکن جب آپ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے تاکہ اس پر سے اپنے آپ کو گرا دیں تو جبریلؑ آپ کے سامنے آگئے اور کہا کہ یا محمد! آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ اس سے آنحضرت ﷺ کو سکون ہوا اور آپ واپس آگئے، لیکن وحی مزید کئی دنوں تک رکی رہی تو آپ نے پھر ایک مرتبہ ایسا ارادہ کیا، لیکن جب پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے تو حضرت جبریلؑ سامنے آئے اور اسی طرح کی بات پھر کہی۔

ناموس محرم راز کو کہتے ہیں جو ایسے راز سے بھی آگاہ ہو جو آدمی دوسروں سے چھپائے۔"

⊙ الموسوعة القضاية من موسوعه الاحكام الصادرة من المحاكم الاسلامية :

یہ مؤسسة فلاح، لاہور کے تحت تیار کیا گیا تھا اور اس میں بھی نبی ﷺ کے فیصلوں کی جزئیات کو ایک ایک واقعہ کی شکل میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں کل ۳۴۹ فیصلے رقم ہیں اور اس کے متون کو فاؤنڈیشن کی لجنۃ نے تیار کیا۔ متون حدیث کی اس صورت میں مکمل طور پر واقعہ نگاری اور اختیاری اجتہادی ترتیب کو بروئے کار لا کر متن واحد میں احادیث کی جزئیات وزوائد کو اس کے محل پر رکھا گیا ہے۔ اور یہ ترتیب کا انداز پہلے ذکر کردہ مراحل سے جدید اور متون احادیث کے بکھرے ہوئے جزئیات کو اکٹھا کرنے کا بہترین انداز تھا۔

مذکورہ موسوعہ چونکہ نبی ﷺ کے بیان کردہ فیصلوں پر ہے، لہٰذا لجنۃ نے اس موضوع کے اندر نبیؐ کے تمام فیصلے اکٹھے کر دیئے ہیں اور اس کام میں انکی واقعہ نگاری کرتے ہوئے کتب احادیث، مصنفات اور زوائد کو خاص طور پر مصدر بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کتب سیر سے بھی روایات کو لیا گیا ہے۔

مثال:

حکم رسول اللہ ﷺ فی تحکیم سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ

حديث عن عائشة رضى الله عنهاقالت اصيب سعد يوم الخندق رماه رجل من قريش يقال له حبان ابن العرقه رماه فى الأكحل[1] [فقطوا أكحله فحسمه رسول الله صلى الله عليه وسلم بالنار فانتفخت يده فتركه فنزفه الدم فحسمه أخرى فانتخت يده فلما رأى ذلك قال اللهم لا تخرج نفسى حتي تقر عينى من بنى قريظة فاستمسك عرقه فما قطر قطرة][2]فضرب النبى صلى الله عليه وسلم خيمة فى المسجد ليعود من قريب فلما رجع رسول الله من الخندق وضع السلاح واغتسل فأتاه جبريل عليه السلام وهو ينقض رأسه من الغبارفقال: قد وضعت السلاح!والله ما وضعته أخرج إليهم قال النبى فأين؟فأشارإلى بنى قريضة [فلبس رسول الله لامته وأذن في الناس بالرحيل][3][قال لايصلين أحد العصر إلا في بنى قريظة][4] [فخرج رسول الله فمر على بنى غنم وهم جير ان المسجد فقال من مر بكم؟فقالوا مر بنا دحية الكلبى وكان دحية تشبه لحيتة ووجهه جبريل عليه السلام قالت][5] [فأتاهم رسول الله صلى الله عليه وسلم [فحاصرهم خمساء وعشرين ليلة.فلما اشتد حصارهم واشتد البلاء قيل لهم انزلوا على حكم رسول الله فاستشاروا أبا لبابة بن عبدالمنذر فأشاره إليهم أنه الذبح][6] فنزلوا على حكمه فرد الحكم إلى سعد[قال ألا ترضون يامعشر الأوس أن يحكم فيهم رجل منكم

---

١ الصحيح البخارى، كتاب المغازى ، باب مرجع النبیﷺ من الاحزاب، رقم الحديث: ٤١٢٢

٢ السنن الترمذى، كتاب السير ، باب ماجاء فى النزول على الحكم، رقم الحديث: ١٥٨٢

٣ مجمع الزوائد للهيثمى ،(القاهرة:مكتبة القدسى، ١٤١٤ھ):١٣٧،٦

٤ الصحيح البخارى، كتاب المغازى ، باب مرجع النبیﷺ من الاحزاب، رقم الحديث: ٤١١٩

٥ مجمع الزوائدللهيثمى :١٣٨،٦

٦ ايضا

فقالوا :بلى قال رسول الله فذلك سعد بن معاذ][1][نزل أهل قريظة على حكم سعد بن معاذفأرسل رسول الله إلى سعد فأتاه على حمار][2][عليه إكاف من ليف قد حمل عليه وحف به قومه][3][وكان رجلا جسيما جميلا][4] [قالوا له يا أبا عمروحلفاؤك ومواليك وأهل النكاية ومن قد علمت فلم يرجع إليهم شيئا ولايتفت إليهم حتى إذا دنا من دورهم إلتفت إلى قومه فقال: قد أنى لى أن لا يأخذنى فى الله لومة لائم][5] [فلما دنا من المسجد قال رسول الله صلي الله عليه و سلم قوموا إلى سيدكم أو خيركم][6] [فأنزلوه][7] [فجاء حتى قعد إلى جنب النبى][8] [ثم قال النبى صلي الله عليه و سلم إن هؤلاء نزلوا على حكمك][9][احكم فيهم يا سعد ،قال الله ورسوله أحق بالحكم قال قد أمرك الله أن تحكم فيهم][10] قال فإنى أحكم فيهم ان تقتل المقاتلة وأن تسبى النساء والذرية وأن تقسم أموالهم [يستعين بهن المسلمون][11] [فقال رسول الله صلي الله عليه و سلم لقد حكمت عليهم بحكم الله من فوق سبعة

---

۱ ابن هشام ، السيرة النبوية، (مصر :مكتبة مصطفى البابى، ۱۳۷۵ھ):۲۳۹،۲

۲ الصحيح مسلم، كتاب الجهاد ، باب جواز القتال من نقض العهد،رقم الحديث:۱۷٦۸

۳ مجمع الزوائد للهيثمى : ۱۳۸،٦

۴ السيرة النبوية لابن هشام:۲۳۹،۲

۵ مجمع الزوائدللهيثمى : ۱۳۸،٦

٦ الصحيح مسلم،كتاب الجهاد والسير ، باب جواز القتال من نقض العهد،رقم الحديث:۱۷٦۸

۷ مجمع الزوائدللهيثمى : ۱۳۸،٦

۸ سنن سعيد بن منصور ، كتاب الجهاد ، باب جامع الشهادة ،(الهند :الدار السلفية ،الطبعة الاولى،۱۹۸۲ء) ۳۹٦،۲

۹ الصحيح مسلم، كتاب الجهاد ، باب جواز القتال من نقض العهد،رقم الحديث:۱۷٦۸

۱۰ ، فتح البارى لابن حجر: ٤١٢،٧

۱۱ سنن الترمذى، ، كتاب السير ، باب ماجاء فى النزول على الحكم، رقم الحديث: ۱۵۸۲

أرقعة][1][فحبسهم رسول الله بالمدينة فى دار بنت الحارث إمرأة من بنى النجار،ثم خرج رسول الله صلي الله عليه و سلم إلى سوق المدينة فخندق بها خنادق ثم بعث إليهم ،فضرب أعناقهم فى تلك الخنادق يخرج بهم إليه ارسالاً وفيهم عدوا الله حيى بن أخطب وكعب بن أسد رأس قوم][2][وكانو أربعمائة][3]قال عروة عن عائشة رضى الله عنها أن سعد قال اللهم أنك تعلم أنه ليس أحد أحب إلى أن أجاهدهم فيك من قوم كذا رسولك و أخرجوه، اللهم فإنى أظن أنك قد وضعت الحرب بيننا وبينهم فإن كان بقي من حرب قريش شيء فأبقنى حتى أجاهدهم فيك وإن كنت وضعت الحرب فافجرها واجعل موتتى فيها فانفجرت من لبته فلم يرعهم وفى المسجد خيمة من بنى غفار إلا الدم يسيل إليهم فقالوا يا أهل الخيمة ما هذا الذى ياتنا من قبلكم؟فإذا سعد يغذوا جرحه دما[فما زال يسيل][4] فمات منها رضى الله عنه[قال جابر قال رسول الله لقد اهتز عرش الرحمن لموت سعدبن معاذ][5]

"عائشہؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: غزوہ خندق کے موقع پر سعد زخمی ہو گئے تھے۔ قریش کے ایک کافر شخص حران بن عرقہ نے ان پر تیر چلایا جو ان کے بازو کی رگ میں لگا۔[ان کے بازو کی رگ کٹ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے اسے آگ کے ساتھ داغ دیا جس سے ان کا ہاتھ پھول گیا تو آپ ﷺ نے اسے کھول دیا۔ ان کا خون کافی مقدار میں بہہ گیا۔ پھر دوسری دفعہ اسے داغا تو وہ دوبارہ پھول گیا، جب معاذ نے یہ صورت دیکھی تو انہوں نے دعا کی: اے اللہ! اس وقت تک میری جان نہ نکلے جب تک میں بنو قریظہ کے انجام کو نہ دیکھ لوں، انہوں نے اپنی رگ کو پکڑ لیا پھر ایک قطرہ

---

١ دلائل النبوة للبيهقي ،(بيروت :دار الكتب العلمبة، الطبعة الاولى، ١٤٠٥ھ)، ١٨،٤

٢ السيرة النبوية لابن هشام :٢٤١،٢

٣ سنن الترمذى، كتاب السير ، باب ماجاء فى النزول على الحكم، رقم الحديث: ١٥٨٢

٤ الصحيح مسلم،كتاب الجهاد والسير ، باب جواز القتال من نقض العهد،رقم الحديث:١٧٦٩

٥ الصحيح مسلم، كتاب الفضائل ، باب من فضائل سعد بن معاذ، رقم الحديث: ٢٤٦٦

بھی خون نہ نکلا] رسول اللہ ﷺ نے معاذ کے لیے مسجد میں خیمہ لگا دیا تاکہ قریب رہ کر ان کی عیادت کر سکیں۔ جب رسول اللہ ﷺ خندق سے واپس آئے تو ہتھیار اتار کر غسل فرمالیا تو جبریلؑ ان کے پاس آئے وہ گرد و غبار سے اپنا سر جھاڑ رہے تھے اور کہا آپ ﷺ نے ہتھیار اتار دیے ہیں، اللہ کی قسم! میں نے ابھی نہیں اتارے، ان کی طرف نکلیے، نبی ﷺ نے پوچھا: کہاں؟ تو انہوں نے بنو قریظہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ [رسول اللہ ﷺ نے اپنا خود پہن لیا اور لوگوں کو کوچ کا حکم دیا] [آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی عصر کی نماز بنو قریظہ کے محلے میں پہنچے بغیر نہ پڑھے] [رسول اللہ ﷺ نکلے، جب بنو غنم کے پاس سے گزرے جو مسجد کے پڑوسی تھے، ان سے پوچھا: تمہارے پاس سے کون گزرا ہے؟ انہوں نے کہا: ہمارے پاس سے دحیہ کلبی گزرے ہیں، جو داڑھی اور چہرے کے اعتبار سے جبریلؑ سے مشابہت رکھتے تھے حضرت عائشہؓ نے کہا] رسول اللہ ﷺ بنو قریظہ کے پاس آئے [ان کا پچیس راتوں تک محاصرہ کیے رکھا۔ جب محاصرہ اور مصیبت سخت ہو گئی تو انہیں کہا گیا کہ تم رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق ہتھیار ڈال دو، انہوں نے ابولبابہ بن عبد المنذر سے مشورہ طلب کیا تو انہوں نے ذبح کرنے کا اشارہ دے دیا] انہوں نے آپ کے فیصلہ پر ہتھیار ڈال دیے لیکن آپ ﷺ نے سعد کو حکم بنا دیا۔ [آپ ﷺ نے پوچھا: اے قبیلہ اوس کے لوگو! کیا تمہیں پسند نہیں ہے کہ تمہارا اپنا آدمی ان کے بارے میں حکم بنے انہوں نے کہا: کیوں نہیں! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ سعد بن معاذ ہیں] [بنو قریظہ نے سعد بن معاذ کو حکم مان کر ہتھیار ڈال دیے تو وہ گدھے پر سوار ہو کر تشریف لائے] [جس گدھے پر وہ سوار تھے اس پر کھجور کی چھال کا پالان تھا اور ان کی قوم کے لوگ ان کے ارد گرد چکر لگا رہے تھے وہ بہت بھرپور جسم والے اور خوبصورت آدمی تھے] [انہیں کہا گیا اے ابو عمرو! یہ آپ کے حلیف اور دوست ہیں یہ قاتل بھی ہیں اور انہیں آپ جانتے بھی ہیں، لیکن وہ ان کی طرف مائل نہ ہوئے اور نہ ان کی طرف جھکاؤ کیا، جب ان کے گھروں کے قریب گئے تو اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: مجھے اس لیے لایا گیا ہے تاکہ مجھے اللہ کے بارے میں، کسی ملامت کرنے والے کی ملامت نقصان نہ دے] [جب وہ مسجد کے قریب ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے سردار یا یوں کہا کہ اپنے بہترین شخص کی طرف اٹھو] [لوگوں نے ان کو نیچے اتار دیا] [وہ آئے اور نبی کریم ﷺ کے پہلو میں بیٹھ گئے] [نبی کریم ﷺ نے فرمایا: انہوں نے آپ کو فیصل مان کر ہتھیار ڈالے ہیں] [اے سعد! ان کے بارے میں فیصلہ کیجیے، انہوں نے کہا:

اللہ اور اس کا رسول ﷺ فیصلہ کرنے کے زیادہ حقدار ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالی نے ان کے بارے میں آپ کو فیصلہ کرنے کا حکم دیا ہے] تو معاذ نے کہا: ان کے بارے میں میرا فیصلہ یہ ہے کہ ان کے لڑائی کے قابل مردوں کو قتل کر دیا جائے، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا جائے اور ان کے مالوں کو تقسیم کر لیا جائے [ان سے مسلمان فائدہ حاصل کریں گے][رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان کے متعلق آپ کا فیصلہ سات آسمانوں کے اوپر اللہ تعالی کے فیصلے کے مطابق ہی ہے][رسول اللہ ﷺ نے انہیں مدینہ میں بنت حارث کے گھر میں قید فرمادیا جو بنی نجار کی ایک عورت تھی۔ پھر آپ ﷺ مدینہ کے بازار کی طرف نکلے اور وہاں خندقیں کھدوائیں، ان کو وہاں لایا جاتا اور ان خندقوں میں قتل کر دیا جاتا، ان میں اللہ تعالی کا دشمن حی بن اخطب اور سردار قوم کعب بن اسد بھی تھا][ان کی تعداد چار سو تھی]۔ عروہ نے حضرت عائشہؓ سے روایت بیان کی کہ سعد نے یہ دعا کی تھی: اے اللہ تعالی! تو خوب جانتا ہے کہ اس سے زیادہ مجھے کوئی چیز عزیز نہیں کہ میں تیرے راستے میں اس قوم سے جہاد کروں جس نے تیرے رسول ﷺ کو جھٹلایا اور انہیں ان کے وطن سے نکالا، لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو نے انکی اور ہماری لڑائی ختم کر دی ہے۔، لیکن اگر قریش سے ہماری لڑائی کا بھی سلسلہ ابھی باقی ہو تو مجھے اس کے لیے زندہ رکھیے۔ یہاں تک کہ میں تیرے راستے میں ان سے جہاد کروں اور اگر لڑائی کے سلسلے تو نے ختم ہی کر دیے ہیں تو میرے زخموں کو پھر سے ہرا کر دے اور اسی میں میری موت واقع کر دے۔ اس دعا کے بعد سینے پر ان کا زخم پھر سے تازہ ہو گیا۔ مسجد میں قبیلہ بنو غفار کے صحابہ کا بھی ایک خیمہ تھا۔ خون ان کی طرف بہہ کر آیا تو وہ گھبرا گئے اور انہوں نے کہا: اے خیمہ والو! تمہاری طرف سے یہ خون ہماری طرف کیوں بہہ کر آرہا ہے؟ دیکھا تو سعد کے زخم سے خون بہہ رہا تھا[پھر وہ خون بہتا ہی رہا] اسی سے ان کی وفات ہو گئی[رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سعد بن معاذ کی موت سے اللہ تعالیٰ کا عرش ہل گیا]"

مذکورہ بالا تفصیلی مندرجات سے متون احادیث کی واقعاتی تدوین کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ مسائل کے فقہی استنباطات کے لیے ضروری ہے کہ احادیث کے تمام تر ذخیرے کو اس ڈھب پر مدون کر دیا جائے کہ ہر حدیث کے متون و زوائد ایک ہی جگہ سے حاصل ہو سکیں جس سے متعلقہ حدیث کی نہ صرف پوری جزئیات سامنے آجاتی ہیں بلکہ وہ فقہی اختلافات جو احادیث میں الفاظ وعبارات پر اطلاع نہ پانے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں انکی درستی ہو سکتی ہے۔ اور طالبان علم و قانون اس سے کماحقہ استفادہ کر سکیں۔

اہل سنت اور اہل تشیع کے اصول حدیث

اصولِ حدیث و خبر میں اہل سنت اور اہل تشیع کا موازنہ

ابو خزیمۃ علی مرتضی طاہر

ملت اسلامیہ کے امتیازات میں فنِ اسناد بھی ہے جو شریعت اور تاریخ دونوں میں یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ عبد اللہ بن مبارکؒ کا مشہور قول ہے: لو لا الإسناد لقال من شاء ما شاء فنِ اسناد کے دو پہلو ہیں: رجال اور تحمل و اداء۔ فنِ تاریخ بھی خبر کی قسم میں سے ہے اس لیے ہر خبر کے لیے ایک یا زیادہ رواۃ کی ضرورت ہوتی ہے، اگرچہ شریعت اور عام تاریخی خبروں کے معیارات میں فرق ہے۔ چونکہ پچھلی امتوں میں نبی اور حکمران الگ الگ رہے ہیں جو پہلی دفعہ حضرت داوٗدؑ میں نبوت اور بادشاہت کی صورت میں اکٹھے ہوئے، اس لیے قرآن کریم میں: ﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ﴾ میں دونوں کی مشترکہ خلافت کی بات کی گئی ہے، خاتم النبیین محمد ﷺ میں بھی دونوں حیثیتیں جمع ہوئیں لیکن آپؐ کی وفات کے بعد حکمرانی میں 'خلافت' کا سلسلہ قائم ہوا جبکہ آپ کی نبوت بلا اختلاف کل انسانیت کے لیے تا قیامت باقی ہے، آپ ﷺ کے بعد امتِ مسلمہ میں پہلا اختلاف امامت و خلافت کا تھا جو بعض خوفناک تاریخی حوادث کی وجہ سے عقیدہ و مذہب کا نزاع بن گیا ورنہ خلافت عہدہ سیاسی ہوتا ہے، البتہ وہ نبوت کا لاحقہ ہونے کی بنا پر شدید تعصبات کا شکار ہو گیا ہے جسے ختم کرنے یا قربت پیدا کرنے کی اَن گنت کوششیں کی گئیں لیکن امت میں سیاسی وحدت قائم نہ ہو سکی، تاہم امام مہدی کے دور میں نہ صرف مسلمان اکٹھے ہو جائیں گے بلکہ اہل کتاب بھی عیسیٰؑ کی موت سے قبل سب ایمان لے آئیں گے۔ چونکہ اب شیعہ سنی دونوں امتِ اسلامیہ کے مستقل فرقے ہیں جس لیے شریعت کا ثبوت صرف روایت و درایت کی بنا پر ہے۔ سطورِ ذیل میں ان کے فنِ روایت و درایت کے جزوی اختلافات کا ایک علمی موازنہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ وہ وجوہ سامنے آجائیں جو دونوں فرقوں کی کتاب و سنت کے مشترکہ نعرے کے باوجود اصل بنیاد اجاگر ہو جائے جو مسئلہ 'خلافت ہے، ورنہ فقہی طور پر زیدیہ اور حنفیہ کا جو تقارب ہے شائد جعفریہ اور شوافع کا تقارب اس سے بڑھ کر ہے۔ بہر صورت مسئلہ خلافت جو ایک قصہ ماضی ہے اگر اسے حال اور مستقبل کے تقاضوں سے دیکھا جائے تو امت محمدیہ میں اتحاد و اشتراک کی راہیں نکل سکتی ہیں۔ اللہ ارحم الراحمین مسلمانوں کو 'رحمۃ اللعالمین' کے جھنڈے تلے متحد کر دے۔ (محدث)

امتِ اسلامیہ جب مختلف گروہوں میں تقسیم ہوئی تو ہر گروہ نے اپنے اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لیے بے بنیاد باتوں کو رسول اکرم کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا، اس طرح وضع حدیث کا فتنہ شروع ہوا۔ پھر ہر جماعت گروہ در گروہ تقسیم ہوتی چلی گئی۔ ان میں سے کچھ تو ختم ہو گئے اور کچھ کا وجود کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ جو فرقہ سب سے پہلے امت سے الگ ہوا وہ اہل تشیع ہیں۔ وضع حدیث کا چلن عام ہوا تو علماء و محدثین نے حدیث کے ذخیرے کو محفوظ رکھنے کے لیے روایت کے قبول و رد اور رواۃ کی جرح و تعدیل کے اصول و ضوابط مرتب کیے اور اس علم کو "فنِ حدیث یا فنِ روایت و درایت" کا نام دیا۔ اسی فن کی بدولت رسول اللہ ﷺ سے منسوب کی جانے والی جھوٹی اور غیر ثابت روایات کی حقیقت واضح ہوتی اور فرق باطلہ کی قلعی کھلتی ہے۔ اس لحاظ سے علوم الروایۃ کا فن امتِ مسلمہ کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔

شیعہ کے بھی کئی فرقے ہیں، جنہیں مجموعی طور پر امامیہ بھی کہتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں دین کی اصل بنیاد امام ہیں تاہم ان میں شریعت کے قائلین اور صرف امامت کا عقیدہ کے فرق کے اعتبار سے تقسیم بھی ہے اول الذکر اسماعیلی اور علوی کہلاتے ہیں جنہیں امامیہ بھی کہا جاتا ہے یہ شریعتِ محمدیہ کو نہیں مانتے جبکہ ثانی الذکر شریعتِ محمدیہ کے قائل ہیں ان میں سے زیدیہ اور اثنا عشریہ (جعفریہ) ہیں، زیدیہ تو اہلِ سنت کے بہت قریب ہیں البتہ جعفریہ نے بھی کسی حد تک اصول روایت کے متعلق تصنیف و تالیف کی ہیں۔ جن میں احادیث کی تعریفات وغیرہ میں اہل سنت سے کسی قدر ہم آہنگی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے یہ اصطلاحات اہل سنت سے لی ہیں، ان کے خاص اصول و ضوابط ہیں، لیکن ان میں اصول تاریخ کا رنگ وڈھنگ پایا جاتا ہے، اسی لئے اہلِ سنت انہیں 'اخباری' کہتے ہیں اسی کے مطابق وہ حدیث کو قبول یا رد کرتے ہیں، اہل تشیع نے احادیث کے موضوعات، کتب کی ابواب بندی، مضامین و مفاہیم، فنی اصطلاحات، رواۃ اور متن کے قبول و ردّ کے اصول و ضوابط سب اپنے مطابق ترتیب دیے ہیں۔ یہ ایک دقیق موضوع ہے، تاہم اس مختصر مقالہ میں ہم اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین اصطلاحاتِ حدیث کے بنیادی اصولوں کا تقابلی جائزہ لیں گے۔ یہ ایک تاریخی فرقہ واریت کا ارتقاء ہے، اس لیے اسے مناظرانہ پسِ منظر کی بجائے خالص تحقیقی نظر سے دیکھا جائے۔

اہلِ سنت کی تعریف:

علامہ ابن حزمؒ اہل سنت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«وَأهل السّنة الَّذين نذكرهم أهل الْحق وَمن عداهم فَأهل الْبِدْعَة فَإِنَّهُم الصَّحَابَة رَضِي الله عنهم وكل من سلك نهجهم من خِيَار التَّابِعين رَحْمَة الله عَلَيْهِم ثمَّ

أَصْحَاب الحَدِيث وَمن اتبعهم من الْفُقَهَاء جيلاً فجيلاً إِلَى يَوْمنَا هَذَا أَو من اقْتدى بهم من الْعَوام فِي شَرق الأَرْض وغربها رَحْمَة الله عَلَيْهِم»[1]

"اہل سنت جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، وہی اہل حق ہیں، ان کے علاوہ سب اہل بدعت ہیں۔ بلاشبہ صحابہ کرام کے نہج پر چلنے والے تابعین عظام، پھر محدثین اور ان کی پیروی کرنے والے فقہا کرام نسل در نسل آج تک اور ان کی اقتدا کرنے والے مشرق و مغرب کے عوام بھی اہل سنت ہیں۔"

حافظ ابن جوزیؒ فرماتے ہیں:

« أهل النقل والأثر المتبعين آثار رَسُول اللهّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وآثار أصحابه هم أهل السنة لأنهم عَلَى تلك الطريق التي لم يحدث فيها حادث وإنما وقعت الحوادث والبدع بعد رَسُول اللهّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وأصحابه»[2]

"اہل نقل واثر میں احادیث رسول ﷺ اور آثار صحابہ کرام کی اتباع کرنے والے ہی اہل سنت ہیں، اس لیے کہ اس طریقے پر چلنے والوں میں کوئی بدعت اور ضلالت نہیں ہے، کیونکہ بدعت اور گمراہی رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے بعد وقوع پذیر ہوئی ہیں۔"

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اہل السنۃ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

« لِأَنَّهُمْ مُتَمَسِّكُونَ بِكِتَابِ الله وَسُنَّةِ رَسُولِهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. وَمَا اتَّفَقَ عَلَيْهِ السَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنْ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ»[3]

"اس لیے کہ وہ بلاشبہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کو مضبوطی سے تھامنے والے ہیں، مہاجر وانصار صحابہ میں سے سابقون اولون اور ان کی اتباع کرنے والے بھی اسی پر متفق تھے۔"

مزید کہتے ہیں:

« فَلَفْظُ 'أَهْلِ السُّنَّةِ ' يُرَادُ بِهِ مَنْ أَثْبَتَ خِلَافَةَ الْخُلَفَاءِ الثَّلَاثَةِ، فَيَدْخُلُ فِي

1. الفصل في الملل والأهواء والنحل لابن حزم الاندلسی : ۲/ ۹۰
2. تلبيس ابليس لابن الجوزی: ۱۷
3. مجموع الفتاوٰی : ۳/ ۳۷۵

ذَلِكَ جَمِيعُ الطَّوَائِفِ إِلَّا الرَّافِضَةَ»[1]

" 'اہل سنت' سے مراد وہ لوگ ہیں جو خلفاء ثلاثہ کی خلافت کو تسلیم کرتے ہیں، اس میں روافض کے علاوہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں شامل ہیں۔"

چنانچہ اہل سنت سے مراد وہ لوگ ہیں جو بدعات سے بچتے ہوئے، عقائد و اعمال اور توحید ورسالت کے اصولوں میں اسی چیز کا تمسک کرنے والے ہوں جس پر نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام تھے۔

اہل تشیع کی تعریف:

لغوی اعتبار سے شیعہ کسی شخص کے اعوان وانصار اور متبعین کو کہا جاتا ہے، جب کہ اصطلاحی مفہوم میں شیعہ سے مراد وہ گروہ ہے جو صلبی آل نبیؐ کے متبعین اور محب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

امام جرجانی اپنی کتاب التعریفات میں لکھتے ہیں:

«الشيعة: هم الذين شايعوا عليًّا، رضي الله عنه، قالوا: إنه الإمام بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم، واعتقدوا أن الإمامة لا تخرج عنه وعن أولاده»[2]

"شیعہ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت علی کا ساتھ دیا، ان کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت علیؓ ہی امام ہیں، ان کا اعتقاد ہے کہ حضرت علیؓ اور ان کے اولاد سے کبھی امامت خارج نہیں ہو سکتی۔"

علامہ ابن منظورؒ رقمطراز ہیں:

« وأَصلُ الشِّيعة الفِرقة مِنَ النَّاسِ، وَيَقَعُ عَلَى الْوَاحِدِ وَالِاثْنَيْنِ وَالْجَمْعِ وَالْمُذَكَّرِ وَالْمُؤَنَّثِ بِلَفْظٍ وَاحِدٍ وَمَعْنًى وَاحِدٍ، وَقَدْ غلَب هَذَا الِاسْمُ عَلَى مَنْ يَتَوالى عَلِيًّا وأَهلَ بَيْتِهِ، رِضْوَانُ اللهِ عَلَيْهِمْ أَجمعين، حَتَّى صَارَ لَهُمْ اسْمًا خَاصًّا فإِذا قِيلَ: فُلَانٌ مِنَ الشِّيعة عُرِف أَنه مِنْهُمْ. وَفِي مَذْهَبِ الشِّيعَةِ كَذَا أَي عِنْدَهُمْ. وأَصل ذَلِكَ مِنَ الْمُشايَعةِ، وَهِيَ الْمُتابَعة والمُطاوَعة؛ قَالَ الأَزهري: والشِّيعةُ قَوْمٌ يَهْوَوْنَ هَوى عِتْرةِ

---

1 منهاج السنة النبوية: ٢/ ٢٢١

2 التعريفات: ١٢٩

النَّبِيَّ، صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ويُوالونهم »[1]

"اصل میں شیعہ لوگوں کا ایک فرقہ ہے، یہ لفظ واحد، تثنیہ، جمع، مذکر، مؤنث کے لیے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے، اور سب کا معنی بھی ایک ہی ہے۔ تحقیق یہ نام غالب طور پر ان لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو حضرت علی اور اہل بیت سے محبت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ یہ ان کا نام بن گیا، اب جب یہ کہا جائے کہ فلاں شیعہ ہے، تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ شخص اسی جماعت کا ہے۔ اور جب یہ کہا جائے یہ شیعہ مذہب میں ایسا ہے تو اس سے مراد ہوتا ہے کہ ان کے ہاں ایسا ہے، شیعہ کی اصل مشایعۃ سے ہے، اور اس کا معنی متابعت اور اطاعت کرنا ہے۔ ازھری کہتے ہیں کہ شیعہ ایسے لوگ ہیں جنہیں نبی ﷺ کے خاندان پر فخر کرتے اور ان سے محبت کرتے ہیں۔"

یعنی شیعہ کا اطلاق صرف اس گروہ پر ہوتا ہے جو سیدنا علیؓ کا ساتھ دینے والے تھے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

« وَلِهَذَا كَانَتِ الشِّيعَةُ الْمُتَقَدِّمُونَ الَّذِينَ صَحِبُوا عَلِيًّا، أَوْ كَانُوا فِي ذَلِكَ الزَّمَانِ لَمْ يَتَنَازَعُوا فِي تَفْضِيلِ أَبِي بَكْرٍ، وَعُمَرَ، وَإِنَّمَا كَانَ نِزَاعُهُمْ فِي تَفْضِيلِ عَلِيٍّ، وَعُثْمَانَ، وَهَذَا مِمَّا يَعْتَرِفُ بِهِ عُلَمَاءُ الشِّيعَةِ الْأَكَابِرُ مِنَ الْأَوَائِلِ، وَالْأَوَاخِرِ حَتَّى ذَكَرَ مِثْلَ ذَلِكَ أَبُو الْقَاسِمِ الْبَلْخِيُّ. قَالَ: سَأَلَ سَائِلٌ شَرِيكَ بْنَ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي نَمِرٍ ، فَقَالَ لَهُ: أَيُّهُمَا أَفْضَلُ أَبُو بَكْرٍ، أَوْ عَلِيٌّ؟ فَقَالَ لَه أَبُو بَكْرٍ، فَقَالَ لَهُ السَّائِلُ: أَتَقُولُ هَذَا، وَأَنْتَ مِنَ الشِّيعَةِ؟ فَقَالَ: نَعَمْ إِنَّمَا الشِّيعِيُّ مَنْ قَالَ مِثْلَ هَذَا ، وَاللهِ لَقَدْ رَقِى عَلِيٌّ هَذَا الْأَعْوَادَ، فَقَالَ: أَلَا إِنَّ خَيْرَ هَذِهِ الْأُمَّةِ بَعْدَ نَبِيِّهَا أَبُو بَكْرٍ، ثُمَّ عُمَرُ، أَفَكُنَّا نَرُدُّ قَوْلَهُ؟ أَكُنَّا نُكَذِّبُهُ؟ وَاللهِ مَا كَانَ كَذَّابًا! »[2]

"قدیم شیعہ تو وہ تھے جنہوں نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا تھا، یا اس زمانے کے لوگ جو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی افضیلت کا نزاع کھڑا نہیں کرتے لیکن حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان

١ لسان العرب : فی مادة 'شیع'

٢ منهاج السنة النبوية: ١/ ١٣-١٤

افضلیت کا معاملہ کھڑا کرتے ہیں، پہلے اور پچھلے اکابر شیعہ علماء نے اس کا اعتراف کیا ہے، یہاں تک کہ اسی طرح کی ابو القاسم بلخی نے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے شریک بن عبد اللہ بن ابو نمیر سے پوچھا ابو بکر افضل ہیں یا علی افضل ہیں، تو اس نے کہا: ابو بکر۔ سائل نے کہا: آپ شیعہ ہو کر یہ کہہ رہے ہیں؟ اس نے کہا: ہاں، بلکہ ہر شیعہ یہی کہتا ہے۔ اللہ کی قسم! حضرت علی نے چھڑی پر ٹیک لگائی اور فرمایا: خبر دار! اس امت میں نبی ﷺ کے بعد سب سے بہتر ابو بکر، ان کے بعد عمر ہیں۔ تو کیا ہم ان کے قول کو رد کر دیں، کیا ہم انہیں جھٹلائیں؟ اللہ کی قسم وہ جھوٹے نہیں ہیں۔“

حافظ ابن حزم نے شیعہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

« وَمن وَافق الشِّيعَة فِي أَن عليا رَضِي الله عَنهُ أفضل النَّاس بعد رَسُول الله صلى الله عَلَيْهِ وَسلم وأحقهم بِالْإِمَامَةِ وَولده من بعده فَهُوَ شيعي وَإِن خالفهم فِيمَا عدا ذَلِك مِمَّا اخْتلف فِيهِ الْمُسلمُونَ فَإِن خالفهم فِيمَا ذكرنَا فَلَيْسَ شِيعِيًّا »[1]

”جس شخص نے اس مسئلہ میں شیعہ کی موافقت کی کہ حضرت علی رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل ہیں، اور امامت کے حقدار ہیں اور ان کے بعد ان کی اولاد حقدار ہے، وہ شیعہ ہے، اگرچہ وہ دوسرے معاملات میں ان کی مخالفت کرے جن کی دوسرے مسلمان مخالفت کرتے ہیں، اگر وہ ان چیزوں میں ان کی مخالفت کرے جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے تو وہ شیعہ نہیں ہے۔“

اہل تشیع کے تاریخی ادوار میں کئی فرقوں نے جنم لیا، ان میں غیوبت کا بنیادی اصول ہے جو کامل طور پر اسمعیلیوں میں پایا جاتا ہے جو شریعت محمدیہ کے ہی قائل نہیں، پھر اثنا عشریہ ہیں جو امام محمد حسن عسکری تک تو شریعت کے قائل ہیں لیکن ان کا بارھواں امام کئی صدیوں سے غائب ہے یہ بھی اخباری اور اصولی دو فرقوں میں بٹ گئے: ۱-اثنا عشریہ اخباری ۲-اثنا عشریہ اصولی۔

'شیعہ اثنا عشریہ اخباری' کے نمایاں عقائد میں عصمت امام ہے اور وہ شیعہ کتب اربعہ میں موجود تمام اصول و فروع کو من و عن تسلیم کرتا ہے جبکہ شیعہ 'اثنا عشریہ اصولی' تقلید کے قائل ہیں اور اہل سنت کی طرح احادیث کو تحقیق کی بنیاد پر قبول کرتے ہیں۔ یہی دوسرا فرقہ ہماری بحث کا محور رہے گا کیونکہ اسی فرقے نے

---

۱ الفصل في الملل والأهواء والنحل: ۲/ ۸۹-۹۰

احادیث کی تحقیق کے لیے کچھ خاص اصول وضع کیے ہیں، جنھیں ہم اجمالاً بیان کریں گے، دونوں فریق، مسئلہ بداء، رجعت، متعہ اور عام صحابہ کرام کو غیر معتبر سمجھنے جیسے عقائد کے حامل ہیں۔

اس مضمون میں پہلے حدیث وسنت کی تعریف، پھر نقد وجرح کے ساتھ تعدد رواۃ کے علاوہ قبول ورد کے اعتبار سے احادیث کی درجہ بندی پیش کروں گا۔ ان شاء اللہ

اصطلاحات حدیث وان کی تعریفات ومفاہیم میں اہلسنت اور اہل تشیع کے مبادیات میں فرق:

اہل سنت اور اہل تشیع کے فن حدیث مع اصطلاحات وغیرہ کا بنیادی فرق ہے، اسی فرق کے سبب سے فریقین کا فنِ حدیث ایک دوسرے سے کافی حد تک مختلف ہو جاتا ہے، ذیل میں چند اہم اساسی امور کے متعلق فریقین کا نظریہ بیان کیا جاتا ہے:

۱- سنت:

اہل سنت کے نزدیک سنت کی تعریف:

اہل سنت کے ہاں حدیث وسنت نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا قول، عمل اور تقریر ہے

(یہاں سنت کا لفظ مستقل الہامی ماخذ کے پس منظر میں بولا جا رہا ہے، ورنہ دورِ تقلید میں اہل سنت کے ہاں حدیث، اثر یا سنت کا اطلاق آپ ﷺ کے خَلقی اور خُلقی اوصاف کے علاوہ خلفائے راشدین کے منہج حکومت پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ اطلاق خلافت علی منہاج النبوۃ کے معنی میں ہے۔)

حافظ ابن رجب ؒ سنت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

« وَالسُّنَّةُ: هِيَ الطَّرِيقَةُ الْمَسْلُوكَةُ، فَيَشْمَلُ ذَلِكَ التَّمَسُّكَ بِمَا كَانَ عَلَيْهِ هُوَ وَخُلَفَاؤُهُ الرَّاشِدُونَ مِنَ الِاعْتِقَادَاتِ وَالْأَعْمَالِ وَالْأَقْوَالِ، وَهَذِهِ هِيَ السُّنَّةُ الْكَامِلَةُ، وَلِهَذَا كَانَ السَّلَفُ قَدِيمًا لَا يُطْلِقُونَ اسْمَ السُّنَّةِ إِلَّا عَلَى مَا يَشْمَلُ ذَلِكَ كُلَّهُ، وَرُوِيَ مَعْنَى ذَلِكَ عَنِ الْحَسَنِ وَالْأَوْزَاعِيِّ وَالْفُضَيْلِ بْنِ عِيَاضٍ »[۱]

"سنت: اس راستے کو کہا جاتا ہے جس پر چلا جاتا ہے۔ یہ اس طریقے پر مشتمل ہے جس پر نبی ﷺ اور خلفاء راشدین تھے اپنے اعتقاد، اعمال اور اقوال کے ساتھ۔ یہی سنت کاملہ ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے

---

۱ جامع العلوم والحکم: ۲/ ۱۲۰

قدیم سلف ان تمام چیزوں کے مجموعے پر سنت کا اطلاق کرتے تھے۔ حسن بصریؒ، اوزاعیؒ اور فضیل بن عیاضؒ سے یہی معنی مروی ہے۔"

اہل تشیع کے ہاں سنت کی تعریف:

اہل تشیع کے ہاں بھی شریعت کا دوسرا بڑا ماخذ حدیثِ رسول ہی ہے، لیکن ان کے ہاں حدیث و سنت کا اطلاق آپ ﷺ کے اقوال، افعال و تقریرات کے علاوہ آئمہ معصومین کے اقوال، افعال اور تقریرات پر بھی ہوتا ہے۔ یعنی آئمہ معصومین کے اقوال واحوال بھی شریعت کا مستقل ماخذ اور حدیث و سنت کا مصداق ہیں، معروف شیعہ عالم حیدر حب اللہ لکھتے ہیں:

«واما فی الاصطلاح الخاص بعلوم الدراية و الحديث و المتعارف فی العلوم الدينيه عادة، فتعنی بالسنة قول النبی صلی الله عليه وسلم أو المعصوم عليه السلام أو فعله أو تقريره»[1]

"علوم درایت، حدیث اور عام دینی علوم میں لفظ سنت جو بطور اصطلاح استعمال ہوتی ہے، اس سے مراد نبی ﷺ یا امام معصوم کے قول، فعل اور تقریر ہے۔"

یعنی علوم دینیہ میں لفظ سنت سے مراد فن حدیث مع علم درایہ اور آپ ﷺ یا آئمہ معصومین کا قول، فعل اور تقریر ہے۔ شیعہ اثنا عشریہ کے شیخ عبداللہ مامقانیؒ لکھتے ہیں:

عرف شرع میں حدیث اس کو کہتے ہیں جس کی اضافت نبی اکرم ﷺ کی طرف کی گئی ہو، جبکہ اثنا عشریہ نے حدیث کی اصطلاحی تعریف یوں کی ہے: حدیث معصوم کے قول، فعل یا تقریر کی حکایت کو کہتے ہیں۔[2]

تنبیہ: اثنا عشریہ کے نزدیک معصوم سے مراد نبی ﷺ یا ان کے بارہ اماموں میں سے کوئی ایک ہے۔[3]

معروف شیعہ عالم شیخ رضا المظفر لکھتے ہیں:

---

۱ نظرية السنة فی الفكر الأمامی الشيعی: ۲٤

۲ مقباس الهداية فی علم الدراية،مامقانی، ج ۱ ص ۵۵

۳ أصول الرواية عند الشيعة الامامية،عبد المنعم فرماوی، ص ۱٦۵

«واما فقهاء الامامية بالخصوص فلما ثبت لديهم ان المعصوم من ال البيت يجرى قوله مجرى قول النبى من كونه حجة على العباد واجب الاتباع ،فقد توسعوا فى اصطلاح السنة الى ما يشمل قول كل واحد من المعصومين أو فعله أو تقريره »[1]

شیعہ کے ہاں چونکہ ائمہ معصومین کے اقوال نبی ﷺ کے اقوال کی طرح بندوں پر حجت اور واجب الاتباع ہیں ،اس لئے فقہائے امامیہ نے سنت کی اصطلاح میں توسیع کرتے ہوئے ائمہ معصومین کے اقوال، افعال اور تقریرات کو بھی سنت شمار کیا ہے۔

یہاں ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ امامیہ صرف اسی سنت کو مانتے ہیں جو اہل بیت کے طریق سے یعنی: الصادق، عن أبيه الباقر، عن أبيه زين العابدين، عن الحسن السبط، عن أبيه أمير المؤمنين، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم مروی ہو؛ اس لیے ہر وہ حدیث جو ان کے غیر سے مروی ہے یا اسناد میں کوئی ایسا راوی ہے جو ان کے طریقہ پر امامی نہیں ہے؛ تو وہ ساقط الاعتبار ہے، خواہ وہ صحابی ہی کیوں نہ ہو؛ اسی وجہ سے ان کے نزدیک حضرت ابو ہریرہ، سمرہ بن جندب، مروان بن الحکم، عمر بن الخطاب اور عمرو بن عاص ؓ وغیرہ کا کوئی اعتبار نہیں۔[2]

ملاحظہ: سنت و حدیث کی اصطلاح کا یہ فرق بنیادی اختلافی نکتہ ہے، اسی نکتے پر دونوں حدیثی ذخیرے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو جاتے ہیں، اہل سنت کے ہاں جب حدیث کا محور آپ ؐ کی ذاتِ گرامی ہے، تو تمام حدیثی سرگرمیاں آپ ؐ کے گرد گھومتی ہیں، محدثین کی تالیفات کا بنیادی مقصد آپ ؐ کے فرامین کی جمع و تدوین اور فقہاء و اہل اصول کے حدیثی مستدلات کا منبع آپ ﷺ کی ذات اقدس ہے، جبکہ اہل تشیع کے ہاں ائمہ معصومین بھی ماخذ شریعت ہیں۔ جب ائمہ معصومین کے اقوال و افعال بھی ماخذ شریعت ہیں تو وہ بھی حفاظت و تدوین میں اسی اہتمام کے متقاضی ہیں ،جو اہتمام اقوالِ رسول ﷺ کی حفاظت میں کیا جاتا ہے۔

۲۔ عدالتِ صحابہ:

صحابہ کرام وہ شخصیات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے ساتھی اور معاون بنایا ہے، وحی کے اولین

---

۱ اصول الفقه للمظفر ،۵۵/ ۲

۲ أصل الشيعة و أصولها، ۷۹

مخاطب اور امت تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے ان کو امین قرار دیا ہے۔ اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان شریعت کے مفاہیم و تصورات میں دوسرا بنیادی فرق صحابہؓ کی عدالت اور ان سے مروی روایات کے حکم کا ہے۔

اہل سنت کے ہاں عدالتِ صحابہ:

اہل سنت کا متفقہ اصول ہے کہ تمام وہ حضرات جن کی صحابیت ثابت ہے، ان کی روایت قابل قبول ہے، اہل سنت کے نزدیک صحابہ میں اگرچہ درجات میں تفاضل ہے، لیکن روایت کے اعتبار سے جملہ صحابہ عادل کے مقام پر فائز ہیں، اس لیے صحابہ کے بعد والے رواۃ کی جانچ پڑتال ہوگی، صحابہ کرام کی جانچ نہیں ہوگی۔

اہل تشیع کے ہاں عدالتِ صحابہ:

اہل تشیع نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو کوئی الگ مقام نہیں دیتے، ان کے ہاں صحابہ میں بھی عادل، فاسق، منافق، بدعتی اور دیگر اقسام موجود ہیں، اس لیے اہل تشیع کا دعویٰ ہے کہ وہ صرف عادل صحابہ کی روایات قبول کرتے ہیں اور عادل صحابہ سے مراد وہ صحابہ ہیں، جو حضرت علیؓ کے ساتھ کھڑے رہے، چنانچہ معروف شیعہ عالم احمد حسین یعقوب "نظرية عدالة الصحابه" میں لکھتے ہیں:

« كل الذين وقفوا مع على و والوه هم صحابة عدول »[1]

"وہ تمام لوگ جنہوں نے حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد کی موافقت کی وہ عادل ہیں۔"

اب سوال یہ ہے وہ کتنے صحابہ ہیں، جن کا حضرت علیؓ کے ساتھ موالات ثابت ہیں، تو معروف شیعہ محدث شیخ جعفر سبحانی لکھتے ہیں:

« و قد قمنا بتاليف كتاب حول صحابة النبى الذين شايعوا عليا فى حياة النبى و بعد رحلته الى ان لفظوا اخر نفس من حياتهم فبلغ عددهم ٢٥٠ شخصا »[2]

یعنی ہم نے ان صحابہ کے حالات پر ایک کتاب لکھی ہے، جو زمانہ نبوت اور اس کے بعد آخر وقت تک حضرت علیؓ کے ساتھی رہے، تو ان کی تعداد ۲۵۰ تک ہے۔ ویسے تو صحابہ کرام کی تعداد ایک لاکھ سے زائد کتب تاریخ میں منقول ہے، لیکن جن صحابہ کے احوال (خواہ قلیل ہو یا کثیر) محفوظ ہیں، ان کی تعداد بارہ ہزار

---

١ نظرية عدالة الصحابة:٧٧

٢ كليات فى علم الرجال:٤٩٤

سے اوپر ہے، حافظ ابن حجرؒ کی کتاب 'الاصابة فی تمییز الصحابة' میں ۱۲۴۴۶ صحابہ کرام کے تراجم مذکور ہیں۔

الغرض رواۃ صحابہ کی تعداد قطعی طور پر تو کسی نے استیعاب کے ساتھ بیان نہیں کی، لیکن ایک محتاط اندازے کے مطابق جمیع کتب حدیث کے رواۃ صحابہ کی تعداد دو ہزار کے قریب قریب بنتی ہے، جبکہ اہل تشیع کے ہاں صرف ڈھائی سو کی روایات قابل قبول ہیں، تو گویا اہل تشیع رواۃ صحابہ میں سے صرف پندرہ فیصد صحابہ کی روایات لیتے ہیں، اور پچاسی فیصد رواۃ صحابہ کو غیر عادل قرار دے کر ان کی روایات کو رد کرتے ہیں، جن میں مکثرین صحابہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ جیسی شخصیات بھی شامل ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عدالتِ صحابہ کے نظریے کو نہ ماننے کی صورت میں کتنی احادیث کو رد کرنا پڑیں گی، یہی وجہ ہے کہ شیعہ کتب احادیث میں مرفوع (یعنی نبی ﷺ سے منسوب) روایات انتہائی قلیل ہیں۔

مراتب صحابہ:

شیعہ امامیہ کے نزدیک نبی کریم ﷺ کا صحابی بننا کوئی خوبی کی بات نہیں ہے، اسی لیے ان کے نزدیک صحابی کی توثیق کی حاجت ہوتی ہے! جیسا کہ اوپر اس کا بیان گزرا ہے، نیز شیعہ امامیہ کے عالم مامقانی لکھتے ہیں:

"عدالت کے متعلق صحابہ اور دیگر لوگوں کا حکم یکساں ہے، آدمی کا صرف صحابی ہونا اس کے عادل ہونے پر دلالت نہیں کرتا بلکہ ان کے اندر عدالت کا پایا جانا ضروری ہے، ہاں اگر صحابی ہونا ثابت ہے تو اب ان کے اسلام کی تفتیش کی ضرورت نہیں، لیکن اگر کوئی نبی ﷺ کے بعد مرتد ہو گیا ہو تو تفتیش ضروری ہے؛ لہذا عامہ (اہل سنت و جماعت) جو یہ کہتے ہیں کہ تمام صحابہ یہاں تک کہ وہ لوگ جنہوں نے امیر المومنین علیہ السلام سے قتال کیا سب عادل ہیں، محض عناد ہے"[1]

اپنی اسی رائے کی بنا پر انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مختلف مراتب بیان کئے ہیں:

(۱) وہ صحابہ جن کی عدالت معلوم ہے، جیسے سلمان فارسی، ابو ذر غفاری، عمار بن یاسر، جابر بن عبد اللہ، بلال بن رباح اور وہ لوگ جنہوں نے آل بیت کی مدد اور ان کی اتباع کی۔

(۲) وہ صحابہ جن کا فسق و جھوٹ معلوم ہے، ہر وہ صحابی جو آل بیت سے منحرف ہوا اور ان کے لیے عداوت و بغض کا اظہار کیا، جیسے ابوہریرہؓ، انس بن مالکؓ اور سیدہ عائشہؓ وغیرہ۔

---

۱ مقباس الهداية فی علم الرواية ، مامقانی، ج۳ ص۳۰۵

(۳) وہ صحابہ جن کی حالت معلوم نہیں، اس باب میں شیعہ امامیہ کے علمانے کوئی مثال پیش نہیں کی۔

شیعہ امامیہ کے نزدیک صحابہ میں سے جن کی عدالت معلوم ہے ان کی روایت مقبول، جو فسق وفجور سے متصف ہیں ان کی روایت غیر مقبول ہے، اور جن کی حالت مجہول ہے ان کی روایت میں توقف کیا جائے گا۔[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد کو آل بیت کا دشمن سمجھنا سوائے جہالت اور عناد کے کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم آل بیت سے محبت کرنے والے تھے۔

عدالت صحابہ کے متعلق درست اور صواب مسلک یہی ہے کہ تمام صحابہ کرام عادل ہیں۔ جب ان کی توثیق وتعدیل اللہ تعالی اور اس کے رسول نے فرمادی؛ تو اب ان کے بارے میں کسی کی توثیق کی حاجت نہیں، اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق وتعدیل کی بنیاد پر ہی اہل سنت وجماعت کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ صحابی ہونا ہی اس کے عادل وثقہ ہونے کے لیے کافی ہے، لہذا تمام صحابہ عادل ہیں۔

۳- اہل سنت اور اہل تشیع کے ہاں حدیث پر نقد کرنے کا معیار:

اہل سنت کے ہاں نقد کا معیار:

اہلسنت کے ہاں اصطلاحات حدیث کا ایک منظم ومرتب فن موجود ہے، جس میں نقد حدیث کے تفصیلی قواعد مذکور ہیں، حدیث کی اقسام، راوی کی جرح وتعدیل کے ضوابط، استدلال کی شرائط اور راویوں کی انواع و اقسام سے متعلق تفصیلات ذکر ہیں، چنانچہ معروف محقق ڈاکٹر نور الدین عتر نے مصطلح الحدیث کے جملہ فنون کو چھ انواع میں تقسیم کیا ہے:

① علوم رواۃ الحدیث: یعنی وہ اصول وضوابط جن کا تعلق رواۃ حدیث سے ہے۔
② علوم روایۃ الحدیث: یعنی وہ علوم وفنون جو حدیث کے تحمل واداو غیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔
③ علوم الحدیث من حیث القبول او الرد: یعنی وہ علوم وضوابط جو حدیث کے قبول ورد سے تعلق رکھتے ہیں۔
④ علوم المتن: وہ ضوابط جو حدیث کے متن سے متعلق ہیں۔
⑤ علوم السند: فنون وضوابط جن کا تعلق حدیث کی سند سے ہے۔

1 الخصال للصدوق، ص ۹۰، أعیان الشیعۃ، ج ۱ ص ۱۱۳

⑥ علوم المشترکه بین السند و المتن: یعنی وہ فنون جن کا تعلق متن وسند دونوں کے ساتھ ہے۔
تفصیل کے لیے دیکھیے: منہج النقد فی علوم الحدیث ،نور الدین عتر، دار الفکر ،دمشق

ان علوم و فنون اور قواعد وضوابط کے انطباق میں تو علمائے اہلسنت کا اختلاف رہا ہے کہ کونسی احادیث علوم الحدیث کی رو سے کس قسم میں داخل ہیں؟ جس کی وجہ سے حدیث کے ضعف وصحت، ارسال و اتصال، موقوف و مرفوع، راوی کی عدالت و جرح، توثیق و تضعیف، کسی کتاب یا محدث کے معتمد و غیر معتمد ہونے کے پیمانے پر اختلاف رہا ہے، لیکن حدیث کو جانچنے کے پیمانے کم و بیش جملہ محدثین کے ہاں یکساں رہے ہیں۔ ان قواعد وضوابط پر اہلسنت کے ذخیرہ حدیث کی ایک ایک روایت کو پرکھا جاچکا ہے، ہزاروں رواۃ کی جرح وتعدیل کے حوالے سے ضخیم کتب لکھی جاچکی ہیں۔

اس موقع پر وضاحت ضروری ہے کہ فقہاء جب حدیث پر بحث کرتے ہیں، تو اس کے قابلِ عمل ہونے یا نہ ہونے کے حوالے سے بحث کرتے ہیں، ورنہ حدیث کے جانچنے کے معیارات فقہاء کے ہاں بھی وہی ہیں جو محدثین نے مرتب کیے ہیں۔

اہل تشیع کے ہاں نقد کا معیار:

جب ہم اہل تشیع کے معیاراتِ نقد حدیث کو دیکھتے ہیں، تو ان پر معیار کا اطلاق مشکل ہو جاتا ہے، حدیث و رواۃ کو پرکھنے سے اہل تشیع روزِ اول سے آج تک دو بڑے گروہوں میں تقسیم ہیں: (۱) اخباری (۲) اصولی

نقدِ حدیث کا اخباری منہج

اس طبقہ میں اہل تشیع کے نامی گرامی اہل علم آتے ہیں، ان کے نزدیک حدیثی ذخیرے کو کسی بھی معیار پر پرکھنا جائز نہیں ہے، سارا حدیثی ذخیرہ نہ صرف یقینی طور پر صحیح ہے، بلکہ بعض اخباریوں کے نزدیک تو سارا ذخیرہ متواتر ہے، معروف شیعہ محقق حیدر حب اللہ اخباریوں کا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" ذهب فريق من الاخباريين الى القول بقطعية الكتب الاربعة ،و تعدى بعضهم الى ما هو ازيد منها .[1]

"'اخباریوں کے ایک گروہ کا موقف ہے کہ کتب اربعہ کی جملہ احادیث قطعی ہیں، اور ان میں سے بعض اس سے بھی آگے کی طرف گئے ہیں (یعنی وہ تمام روایات کو متواتر سمجھتے ہیں)"

---

۱ نظرية السنة فى الفكر الامامى الشيعى،التكون و الصيرورة ، حيدر حب الله: ۲۲۵

بعض غالی قسم کے اخباری کہتے ہیں کہ علوم مصطلح الحدیث سے احادیث کی جانچ پڑتال کرنا ہی درست نہیں ہے، کیونکہ یہ اصلاً اہلسنت کے علوم ہیں، شیعہ کے علوم نہیں ہیں، حیدر حب اللہ لکھتے ہیں:

« رفض الإخباريون الترحيب بعلم الرجال والجرح والتعديل والحديث والدراية بحجّة أنّ هذه العلوم علومٌ سنيّة وليست شيعيّة »[1]

اخباریوں نے علم رجال، جرح وتعدیل اور حدیث کو پرکھنے کے درایتی معیارات کو ترک کیا ہے، کیونکہ اخباریوں کے نزدیک یہ علوم اہلسنت سے ماخوذ علوم ہیں، شیعی علوم نہیں ہیں۔

وہ تمام روایات کو قطعی ثقہ بلکہ متواتر سمجھتے ہیں، اور علوم مصطلح الحدیث پر پرکھنے کے لیے اس لیے منع کرتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ شیعی روایات کو اگر اہل سنت کے قطعی معیار پر پرکھیں گے تو سب کی سب یا اکثر احادیث ضعیف وموضوع نکلیں گی۔

نقد احادیث کا اصولی منہج

اخباری شیعوں کے غیر علمی، غیر منطقی اور محض اعتقاد پر مبنی غیر عقلی موقف کے برعکس اصولی شیعوں کے منہج پر نظر ڈالتے ہیں، تو انہوں نے کتب اربعہ سمیت جملہ حدیثی ذخیرے کو قواعدِ جرح وتعدیل پر پرکھنے کی روش اپنائی ہے، اور اس کے لیے انہوں نے رجال کے احوال اور فن درایۃ پر مشتمل کتب تحریر فرمائیں۔ لیکن افسوس کہ ان کے اصولی منہج میں بھی بعض ایسے مہیب خلا موجود ہیں، جن کی وجہ سے یہ منہج بعض جہات سے شیعہ ذخیرہ حدیث کو پرکھنے کے حوالے سے بے فائدہ بن جاتا ہے۔

سب سے اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ حدیث کو پرکھنے کے حوالے سے اہل تشیع کے قدماء محدثین جن میں خاص طور پر کتب اربعہ کے مصنفین شامل ہیں اور متاخرین (ساتویں صدی ہجری کے علامہ حلی وابن طاؤوس) کے منہج میں اصولی وبنیادی فرق ہے، ہم پہلے اس فرق پر شیعہ محققین کی عبارات ذکر کرتے ہیں، پھر دونوں مناہج کے درمیان اصولی فرق سے پیدا شدہ نتائج وسوالات کا ذکر کریں گے:

شیعہ محقق ومحدث جعفر سبحانی متاخرین اور متقدمین کے منہاج میں اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

« المعروف انه لم يكن من تلك المصطلحات اثر بين اصحابنا ،و انما حدثت فی اثناء القرن السابع ،وقد عرفت حقيقة الحال ،واللازم بيان ماهو الدافع الى

1 المدخل الى دراية الحديث ، حيدر حب الله ،ص ٤٧٠

اصطناعها، فقد اشبع بهاء الدین العاملی الکلام فی ذلک فنحن ناتی به برمته ،یقول : هذا لاصطلاح لم یک معروفا بین قدمائنا قدس الله ارواحهم کما هو الظاهر لمن مارس کلامهم ،بل کان المتعارف بینهم اطلاق الصحیح علی کل حدیث اعتضد بما یقتضی اعتمادهم علیه ،او اقترن بما یوجب الوثوق به، الرکون الیه »[1]

ترجمہ: معروف یہ ہے کہ یہ اصطلاحات ہمارے متقدمین کے درمیان موجود نہ تھیں ،بلکہ ساتویں صدی ہجری میں ظہور پذیر ہوئیں، اس کی حقیقت حال ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں، ضروری ہے کہ اب ان اسباب کا ذکر کیا جائے ، جس کی وجہ سے ان اصطلاحات کے وضع کی ضرورت پیش آئی، تو بہاء الدین عاملی نے اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ اصطلاح ہمارے قدماء کے درمیان معروف نہ تھی، قدماء کی کتب سے ممارست رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ہر اس حدیث کو صحیح کہا جاتا تھا، جس کی تائید میں ایسے اسباب ہوتے تھے، جن پر ان علماء کا اعتماد ہوتا، یا اس حدیث کے ساتھ ایسی مؤیدات مل جاتیں، جن کی وجہ سے اس پر وثوق اور اس کی طرف میلان ہو جاتا ہے۔

شیعہ عالم حسن زین الدین عاملی متاخرین کے اصطلاح کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

« فان القدماء لا علم لهم بهذا الاصطلاح قطعا---ولا یکاد یعلم وجود هذا الاصطلاح قبل زمان العلامة »[2]

قدماء کو متاخرین کی اصطلاح کا علم بالکل نہ تھا۔۔۔نہ ہی علامہ (ابن حلی) کے زمانے سے پہلے اس اصطلاح کا وجود تھا۔

محمد جواد کاظم لکھتے ہیں:

« اختلفت انظار المتأخرین للحدیث الصحیح عن القدماء»[3]

یعنی صحیح حدیث سے متعلق متاخرین کے نظریات قدماء سے مختلف ہیں۔

---

١ اصول الحدیث و احکامه فی درایة الحدیث ،جعفر سبحانی : ٤٣

٢ زین الدین حسن عاملی ،منتقی الجمان، ج١، ص١٥،١٤

٣ المنهج الغائی فی تصحیح الحدیث عند الامامیة ،محمد جواد کاظم :٤٦

۴-علم الدرایہ اور فن مصطلح الحدیث

اہل تشیع کے متاخرین نے اہلسنت کے طرز پر مصطلح الحدیث کا فن ایجاد کیا ہے، بلکہ وہ محدثین کے مصطلح حدیث سے ماخوذ ہے۔ پس اپنے نظریات کے مطابق اس میں انہوں نے کچھ تبدیلیاں کی ہیں، اس کو انہوں نے 'علم الدرایۃ' کا نام دیا ہے۔ یہ متعدد وجوہ سے اہلسنت کے علم مصطلح الحدیث سے فروتر اور تساہل پر مبنی ہے۔ اس بحث میں انہی تبدیلیوں کا موازنہ اہل سنت کے علم مصطلح الحدیث سے کریں گے تاکہ ہر دو علوم کے محاسن ومساوی کا تقابل سامنے آسکے۔

۱۔ حدیث کے قبول ورد کے اعتبار سے اہل سنت اور اہل تشیع کے ہاں فرق:

اہل سنت:

اہل سنت وجماعت کے نزدیک قبول ورد کے اعتبار حدیث کی تین قسمیں ہیں: صحیح، حسن اور ضعیف، لیکن متقدمین صرف دو ہی قسم: صحیح اور ضعیف کی تقسیم کرتے تھے اور حسن کو بھی قابل استدلال مانتے تھے۔

اہل تشیع:

شیعہ امامیہ کے نزدیک قبول ورد کے اعتبار سے حدیث کی چار قسمیں ہیں: صحیح، حسن، موثق اور ضعیف، شیعہ امامیہ کے یہاں یہ تقسیم ساتویں صدی ہجری کے نصف میں وجود پذیر ہوئی، ورنہ اس سے پہلے ان کے نزدیک بھی قبول ورد کے اعتبار سے حدیث کی صرف دو قسم صحیح اور ضعیف تھی، شیعہ امامیہ کے ایک عالم محی الدین موسوی لکھتے ہیں:

حدیث کی چار قسمیں صحیح، حسن، موثق اور ضعیف فقہا اور محدثین امامیہ کے نزدیک معروف نہیں تھیں؛ کیوں کہ ان کے نزدیک حدیث یا تو صحیح تھی جو قرائن سے متصف ہو اور قطع یا معصوم علیہ السلام سے صدور کے وثوق کا فائدہ دے، یا ضعیف تھی جو قرائن سے متصف نہ ہو[1]۔

۲- حدیث صحیح: اہل سنت کے ہاں

اہل سنت کے نزدیک صحیح حدیث کے لیے بہت ہی کڑا معیار رکھا گیا ہے، اس سلسلے میں حافظ ابن حجر شرح نخبۃ الفکر میں لکھتے ہیں:

---

۱ قواعد الحدیث، موسوی، ص ۱۵

« وخبر الاحاد بنقل عدل ،تام الضبط ،متصل السند ،غير معلل و لاشاذ هو الصحيح لذاته »[1]

یعنی روایت کے صحیح بننے کے لئے پانچ شروط ہیں:

۱۔ تمام راوی عادل ہوں۔ ۲۔ ضبط میں تام ہوں۔ ۳۔ سند اول تا آخر متصل ہو۔

۴۔ معلل نہ ہو۔ ۵۔ شاذ نہ ہو۔

اہل تشیع کے ہاں

اس کے برخلاف اگر شیعہ علم الدرایہ میں صحیح کا معیار دیکھیں، تو اہلسنت کے معیار سے تساہل پر مبنی نظر آئے گا، چنانچہ معروف شیعہ محدث زین الدین عاملی المعروف بالشہید الثانی اپنی کتاب "البداية فی علم الدراية" میں صحیح کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

« الصحيح وهو ما اتصل سنده الى المعصوم بنقل العدل الامامی عن مثله ،فی جميع الطبقات وان اعتراه شذوذ »[2]

"صحیح حدیث وہ ہے، جس کی سند متصل ہو اور تمام رواۃ عادل اور امامی شیعہ ہوں، خواہ اس حدیث میں شذوذ ہوں"

اہل تشیع کے معیار کے مطابق صحیح حدیث وہ ہو گی، جس میں یہ تین شرائط ہوں:

۱۔ تمام رواۃ عادل ہوں۔

۲۔ تمام رواۃ امامی (شیعہ) ہوں۔

۳۔ اس حدیث کی سند امام تک متصل ہو۔

حدیث کے صحیح ہونے کے لئے اس کا شذوذ اور علت سے سالم ہونا اہل تشیع کے نزدیک ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ شہید ثانی اپنی اسی کتاب کی شرح میں لکھتے ہیں:

« ونبه بقوله "و ان اعتراه شذوذ "على خلاف مااصطلح عليه العامة من

---

۱ نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر، ص: ۵۸

۲ البدايه فی علم الدرايه ، شهيد ثانی ،انتشارات محلاتی :۲۳

تعريفه،حيث اعتبرو سلامته من الشذوذ—و ارادو بالعلة ما فيه من اسباب خفية قادحة يستخرجها الماهر فى الفن، و اصحابنا لم يعتبروا فى حد الصحيح ذلك "[1]

اور انہوں نے "و ان اعتراه شذوذ" کے قول سے عامہ (اہلسنت) سے اختلاف کیا، جن کے نزدیک صحیح کی تعریف میں سلامت عن الشذوذ ضروری ہے، نیز اہل سنت کے نزدیک علت فی الحدیث سے مراد وہ مخفی عیب ہے، جس پر ماہر فن ہی مطلع ہو سکتا ہے، ہمارے اصحاب (شیعی محدثین) نے صحیح کی تعریف میں علت سے حفاظت کی شرط نہیں لگائی ہے۔

شیعہ امامیہ کے شیخ محی الدین موسوی لکھتے ہیں:

صحیح حدیث وہ ہے جس کی سند معصوم علیہ السلام تک عادل امامی، اپنے مثل کے ذریعہ روایت کرے، اور یہ تمام طبقات میں متصل ہو۔[2]

تعریف کی تشریح:

اتصال کی قید سے حدیث مقطوع، معضل اور مرسل خارج ہو گئیں، معصوم سے مراد نبی ﷺ اور ائمہ شیعہ ہیں، عدل کی قید سے حدیثِ حسن خارج اور امامی کی قید سے حدیث موثق نکل گئی۔[3]

ضبط: بعض لوگوں نے عدل کے ساتھ ضابط ہونے کی بھی قید لگائی ہے، مگر اس قید کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ عدل کی قید ضبط کی قید سے بے نیاز و مستغنی کر دیتی ہے۔

شذوذ: شیعہ امامیہ کے نزدیک عدم شذوذ کی قید معتبر نہیں۔

عدم علت: یہ قید بھی ان کے نزدیک قابل قبول نہیں؛ کیوں کہ اتصال کی قید اس سے بے نیاز کر دیتی ہے۔[4]

---

١ شرح البداية فى علم الدراية،منشورات ضياء الفيروز آبادى ،قم ،ص٢٢

٢ قواعد الحديثه موسوى:٤٢

٣ مقباس الهداية،مامقانى، ج١ ص١٤٦

٤ مقباس الهداية،مامقانى، ج١ ص١٥٣

اہل سنت محدثین نے مقبول حدیث کی اقسام میں سے دو اقسام (صحیح لغیرہ اور حسن لغیرہ) کی بنیاد کثرت طرق پر رکھی ہے، کیونکہ اہل سنت کے حدیثی ذخیرے میں تکرار کثرت سے واقع ہوا ہے، جیسا کہ ہم اس کی تفصیل اس سلسلے کی تعداد روایات والے عنوان کے تحت بیان کر چکے ہیں، جبکہ اہل تشیع کے ہاں مقبول حدیث کی چاروں اقسام (صحیح، حسن، موثق، قوی) میں سے کوئی بھی قسم کثرت طرق و اسناد پر مبنی نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل تشیع کے حدیثی ذخیرے میں تکرار نہ ہونے کے برابر ہے، لہذا کثرت طرق واسناد پر مقبول خبر کی کسی قسم کی بنیاد رکھنا امر واقعہ کے اعتبار سے لغو اور ناممکن تھی۔

اہل سنت کے ہاں مقبول حدیث کی دو پہلی اعلی اقسام (صحیح وحسن) میں اتصالِ سند، عدالتِ راوی، عدم شذوذ، عدمِ علت ضروری ہے، صحیح وحسن میں فرق صرف یہ ہے کہ صحیح کے رواۃ ضبط میں اعلی مقام پر فائز ہوتے ہیں جبکہ حسن میں رواۃ نفس ضبط کے حامل ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ درجہ میں صحیح رواۃ سے ناقص ہوتے ہیں، جبکہ اس کے برخلاف اگر ہم اہل تشیع کے ہاں مقبول خبر کی پہلی دو اعلی اقسام (صحیح وحسن) کو دیکھیں، تو ان دونوں میں فرق عدالت کے ثبوت وعدم ثبوت پر ہے کہ صحیح حدیث کے رواۃ سارے امامی عادل ہوتے ہیں، جبکہ حسن حدیث کے رواۃ کی عدالت ثابت نہیں ہوتی، بلکہ وہ مستور الحال ہوتے ہیں، صرف ان کے حق میں مدح مطلق ثابت ہوتی ہے، چنانچہ زین الدین عاملی حسن حدیث کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

« هوما اتصل سنده بأمامي ممدوح من غير نص على عدالته في جميع مراتبه أو في بعضها ،مع كون الباقي من رجال الصحيح »[1]

"حسن حدیث وہ ہے، جس کی سند متصل اور اس کے رواۃ سارے امامی ممدوحین ہوں، جن کی عدالت پر کسی کی کوئی تصریح نہ ہو، تمام طبقات میں یا بعض طبقات میں، اور باقی صحیح حدیث کے رواۃ ہوں۔"

اہل تشیع محدثین نے مقبول حدیث کی پہلی دو اعلی اقسام (صحیح وحسن) کے لیے ایک بنیادی شرط "امامی" ہونا بیان کیا ہے، لہذا شیعہ اصول حدیث کی رو سے راوی خواہ کتنا ہی ضابط، کتنا ہی عادل اور کتنا ہی ثقہ کیوں نہ ہو، اگر وہ امامی نہیں ہے تو اس کی حدیث صحیح یا حسن کے درجہ میں نہیں آسکتی، جبکہ اس کے برخلاف اہل سنت کے

1 البداية في علم الدراية،زين الدين عاملي ،قم المقدسة:٢٤

ہاں سارا زور راوی کی ذاتی عدالت وثقاہت پر ہے، ان میں راوی کا اہل سنت میں سے ہونا شرط نہیں ہے، امام بخاری نے صحیح بخاری میں صحت کے اعلیٰ ترین معیار پر احادیث جمع کی ہیں، اس کے باوجود متعدد ایسے رواۃ کی احادیث اپنی کتاب میں درج کی ہیں جو اہل تشیع یا خارجی ہیں، ان رواۃ کی تفصیل حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری کے مقدمے 'ہدی الساری' میں دی ہے، لہٰذا اہل تشیع کی اس شرط سے ایک خالص علمی سرگرمی میں "مذہبی تعصب" کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔

دوسرا حسن حدیث میں راوی کے عادل وضابط ہونے کی شرط سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

اہل تشیع کے ہاں مقبول حدیث کی اقسام میں سے ایک قسم "قوی حدیث" ہے، شیعہ محدثین کے ہاں اس قسم کی تعریف یوں کی گئی ہے:

« الحديث الذی يکون جميع رواته من الامامية و لم يرد فيهم أو فی بعضهم مدحا كما هو الحال فی الحديث الحسن او ذما فرتبته بعد الحسن و قبل الموثق »[1]

یعنی وہ حدیث جس کے جملہ رواۃ امامی شیعہ ہوں اور ان میں سے سب کے یا بعض کے بارے میں مدح وذم منقول نہ ہو، تو اس کو قوی کہا جاتا ہے، درجہ بندی میں یہ حسن کے بعد اور موثق سے پہلے ہے۔

اس حدیث کے حوالے سے پہلی بات تو قابل بحث یہ ہے کہ اہل سنت محدثین ایسے رواۃ کی حدیث کو مجہول العین (جب اس سے ایک راوی روایت کرے) یا مجہول الحال (جب اس سے دو یا زیادہ راوی روایت کریں) کی درجہ بندی میں لاتے ہیں اور مجہول راوی کی روایت جمہور اہل سنت کے ہاں مردود ہیں، یا بعض محدثین اس کے قبول وعدم قبول میں توقف کرتے ہیں [2]۔ یعنی وہ بھی قبول نہیں کرتے، اسی وجہ سے اہل سنت کی کتب مصطلح الحدیث میں مجہول حدیث مردود حدیث کی اقسام میں شمار کی گئی ہے، جبکہ اہل تشیع محدثین ایسے راوی کی روایت کو مقبول حدیث کی تیسری قسم میں شمار کرتے ہیں، اس سے اہل سنت اور اہل تشیع کے معیاراتِ نقد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

---

۱ دروس فی علم الدراية، سيد رضا مودب، مركز دراسات المصطفى الدولی، قم: ٥٧

۲ دیکھیے: نزهة النظر، بحث الجهالة و اسبابها

دوسری بات یہ قابل ذکر ہے کہ اہل تشیع محدثین نے قوی حدیث کو درجہ بندی میں موثق حدیث سے پہلے رکھتے ہیں، جو مذہبی تعصب (اور ساتھ غیر معقولیت) کی ایک واضح مثال ہے، کہ جس حدیث کے رواۃ کی ثقاہت خود شیعہ اہل علم کی زبانی ثابت ہو چکی ہو، ان کی حدیث باوجود ثقہ ہونے کے ایسے رواۃ سے کم درجہ کی ہے، جو امامی ہوں، لیکن ان کی ثقاہت و عدالت کے بارے میں شیعہ تراث خاموش ہو، گویا اہل تشیع کے ہاں ایک مجہول الحال امامی ایک ثابت شدہ ثقہ (جس کی توثیق خود شیعہ اہل علم کر چکے ہوں) غیر امامی سے روایتِ حدیث میں اعلی شمار ہو گا۔

موثق حدیث: جس حدیث کے کل یا بعض رواۃ غیر امامی ہوں اور ان کی توثیق شیعہ محدثین و اہل علم کی زبانی ثابت ہو چکی ہو۔

۳- حدیث ضعیف:

اہل سنت: وہ حدیث جس میں صحیح یا حسن حدیث کی صفات میں سے کوئی ایک صفت نہ ہو ضعیف کہلاتی ہے۔

اہل تشیع: وہ حدیث ہے جس میں اقسام سابقہ میں سے کسی ایک کی بھی شروط موجود نہ ہوں، اس طرح کہ اس کی سند فسق وغیرہ سے مجروح شخص یا مجہول الحال یا اس کے مشابہ جیسے وضاع وغیرہ پر مشتمل ہو[1]۔

درجات ضعیف: شروط صحت کی کمی کے اعتبار سے حدیث ضعیف کے درجات مختلف ہوتے ہیں، جیسے صحیح، حسن اور موثق کے درجات اوصاف کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں، جس قدر اس کے رجال میں شروط صحت کی کمی ہو گی اسی قدر اس میں ضعف زیادہ ہو گا[2]۔

نوٹ: یہ ایک بہت ہی وسیع اور طویل موضوع ہے، تاہم اس مختصر مضمون میں صرف مبادیات پر ہی بات کی جا سکی ہے، اگر اللہ تعالی کو منظور ہوا تو اس پر بالتفصیل لکھا جائے گا، ان شاء اللہ

---

[1] مقباس الهداية ،مامقانی، ص ۱ج ۱۷۷ [2] ایضاً

اہم خوشخبری: صنفی تبدیلی (transgender) نمبر

قارئین محدث کے لیے اہم خوشخبری ہے کہ محدث کا اگلا شمارہ (392) صنفی تبدیلی نمبر ہو گا۔ ان شاء اللہ

شرح کتاب التوحید (صحیح بخاری)

افادات: حافظ عبد الرحمن مدنی
ترتیب: حافظ عبد الرحمن عزیز

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، حَدَّثَنَا غُنْدَرٌ، حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ أَبِي حَصِينٍ، وَالأَشْعَثِ بْنِ سُلَيْمٍ، سَمِعَا الأَسْوَدَ بْنَ هِلاَلٍ، عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يَا مُعَاذُ ،أَتَدْرِي مَا حَقُّ اللَّهِ عَلَى العِبَادِ؟»، قَالَ: اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ:«أَنْ يَعْبُدُوهُ وَلاَ يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، أَتَدْرِي مَا حَقُّهُمْ عَلَيْهِ؟»، قَالَ: اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: «أَنْ لاَ يُعَذِّبَهُمْ»

’’ہمیں محمد بن بشار نے ‘ہمیں غندر نے بیان کیا، کہ ہمیں شعبہ ابو حصین اور اشعث بن سلیم سے بیان کیا ان دونوں نے اسود بن ہلال سے سنا‘ وہ معاذ بن جبلؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا‘ اے معاذ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ (پھر) آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے؟ عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: (اگر وہ اللہ کا حق پورا کریں تو) وہ انہیں عذاب نہ دے۔‘‘

لطائف الاسناد

مذکورہ سند میں تین راوی شعبہ، ابو معین اور اشعث بن سلیم تبع تابعی ہیں، اور پہلے چاروں راوی صحاح ستہ کی تمام کتب کے رواۃ ہیں، گویا آئمہ حدیث کو ان رواۃ کے کمال عدالت و ثقاہت پر مکمل اعتماد ہے۔

شرح الحدیث

اس حدیث سے امام بخاریؒ دو چیزوں کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں:

اولاً: توحید محض معرفت الٰہی یا اقرار کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل توحید یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد بندے پر اللہ کے کچھ حقوق واجب ہوتے ہیں، بندے کو چاہیے کہ انہیں پورا کرے۔

ثانیاً: توحید الوہیت کا اثبات، کہ اللہ تعالیٰ کو معبود حقیقی مان کر اس کے مطابق عمل کا ارادہ بھی کرے۔ انبیاء علیہم السلام اور کفار کے درمیان ہمیشہ سے یہی اختلاف رہا ہے کہ توحید کے تقاضوں پر عمل پیرا ہونا چاہیے، توحید ربوبیت کہ اللہ تعالیٰ کائنات کا خالق اور تمام قدرتوں کا مالک ہے، یہ تو کفار قریش (مشرکین) کو بھی تسلیم تھا۔ لہٰذا محض توحید ربوبیت کا اقرار نجات کے لیے ناکافی ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے یا توحید کا اقرار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کے کچھ حقوق ہیں، جنہیں پورا کرنا بندوں کا فرض ہے۔ ان میں دو حقوق بنیادی ہیں، ایک، بندہ اپنے خالق ومالک کی تمام قدرتوں (اسماء وصفات) کا اقرار کرے، دوسرا عقیدتاً اور عملاً بھی اللہ کی صفات میں کسی کو اللہ کا شریک (حصہ دار) نہ سمجھے۔ اسی کو توحید عبادت اور توحید الوہیت کہتے ہیں۔

اصطلاحاً یہ توحید ربوبیت اور توحید الوہیت امام ابن تیمیہ کی تعبیر ہے۔ توحید ربوبیت توحید اسماء وصفات پر بھی مشتمل ہے۔ امام ابن قیم نے توحید ربوبیت کو توحید 'علمی خبری' کا نام اس لئے دیا ہے کہ عوام کو اجمالاً اور علماء کو تفصیلاً اس کی معرفت حاصل کرنی چاہیے کیونکہ اسی بنیاد پر اس کا ارتقائی مرحلہ توحید ارادی طلبی ہوگا جسے توحید عبادت بھی کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا دو اقسام دراصل توحید کے دو مرحلے ہیں: ایک یہ کہ اللہ کی پہچان ہو کہ وہ اپنی ذات اور افعال کے اعتبار سے تنہا ہے۔ دوسرا، جب ہمارے علم میں یہ بات آگئی کہ اللہ اپنی ذات، صفات اور افعال میں یکتا ہے تو ہم اس کے مطابق اپنی طلب وارادہ سے عبادت بجالائیں۔

علم نحو میں اس کی مثال جملہ خبریہ اور جملہ انشائیہ ہے۔ خبریہ جس میں دوسرے کو کسی واقعہ کی اطلاع دیتے ہیں، جس سے اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، جب کہ انشائیہ خبر کی بجائے دوسرے سے کسی کام کا مطالبہ کیا جاتا ہے، جیسے کھانا کھاؤ، مت جاؤ وغیرہ۔

مثلاً بعت و اشتریت کے ذریعے اگر آپ کسی کو خبر دیں کہ فلاں چیز میں نے خرید لی ہے اور فلاں چیز میں نے بیچ دی ہے، تو یہ جملہ خبریہ ہے اور اسی جملے کو معاہدۂ خرید وفروخت کے وقت بولیں تو یہ 'انشاء' ہے۔ اسی طرح توحید کے بھی دو پہلو ہیں: علم اور عقیدہ۔ توحید علمی خبری کے اعتبار سے عام طور پر مسلمان اور کفار حتیٰ کہ شیطان بھی یکساں ہوتے ہیں، کیونکہ شیطان کو بھی علم ہے کہ اللہ تنہا ہے، بلکہ اس کو ہم سے زیادہ معرفت ہے۔ اس معرفت میں کفارِ قریش مسلمانوں کے برابر تھے، قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کے اقرار کا تذکرہ کیا گیا ہے:

﴿وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ [العنكبوت: ٦١]

"اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمان وزمین کا خالق کون ہے اور یہ شمس وقمر کو کس نے انسان کے لیے مسخر کیا ہے؟ کفار جواب یہی دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے۔"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ اللہ کو خالق ومالک مانتے ہیں، تو وہ مشرک کیونکر ہیں؟، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ توحید کے خبری پہلو کو تسلیم کر رہے ہیں جبکہ انشائی تقاضے کو تسلیم نہیں کرتے۔ چونکہ خبر کا مقصود اطلاع ہوتا ہے جبکہ انشاء کسی نئی چیز کو وجود میں لانا ہوتا ہے۔ گویا توحید معرفت یا توحید علمی خبری در اصل توحید طلبی ارادی (توحید انشائی) کی تمہید ہے اور توحید انشائی اصل مطلوب ومقصود ہے، لہٰذا تمہید پر ایمان کے باوجود مقصود پر عدم ایمان تمہید کا بھی انکار ہی سمجھا جاتا ہے۔

ابن قیمؒ کی وضاحت کے مطابق انسان کا اللہ سے تعلق توحید طلبی کی صورت ہونا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت واطاعت کی بنا پر ہی وہ اس کی عبادت بجالاتا ہے، مثلاً ایک شخص نماز پڑھتا ہے لیکن اس کو اللہ کی محبت و اطاعت کے طور پر نہیں بلکہ کسی طبی فوائد کے لیے پڑھتا تو یہ نماز بے کار ہے، کیونکہ نماز کے پیچھے طلب خداوندی موجود نہیں ہے۔ اسی طرح محبت اور ایمان کی کمی بیشی کی بنیاد پر عمل کا ثواب ملتا ہے چنانچہ ایک فرمان نبویؐ یوں ہے کہ تمام نماز پڑھنے والے برابر نہیں ہوتے۔ نماز کے دس حصوں میں ایک سے لیکر کامل نماز تک کا اجر مختلف لوگوں کو فرقوں سے ملتا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ طلب ومحبت جس درجہ کی ہے اسی کے مطابق ثواب ہوگا۔ قرآن مجید نے اسی کو خشوع وخضوع سے تعبیر کیا ہے کہ جس میں طلب ومحبت اپنی آخری حدوں کو چھو رہی ہوتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ ﴾ [المؤمنون :١-٢]

"ایماندار لوگ کامیاب ہوگئے۔ جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں۔"

قدیم مسلمان فلاسفہ کا یہ بڑا نقص ہے کہ انہوں نے توحید سے مراد صرف علم لیا گیا، یا علم کی اعلیٰ ترین شکل کو ہی کو توحید کی انتہاء قرار دے دیا گیا ہے، قرون اولی میں انہیں جہمیہ کہا جاتا تھا۔ جبکہ علمائے سلف کا موقف یہ ہے کہ علم وعمل دونوں ایمان کی بنا پر ہوتے ہیں، اصل توحید محبت الٰہی ہے جو کیفیت قلبی ہوتی ہے اسلام اور ایمان کا تقابلی ذکر ہو تو یہی کیفیت ایمانی علم وعمل میں کمی بیشی کی بنیاد ہوتی ہے۔ سلف کا قول الایمان قول و فعل یزید و ینقص مشہور ہے۔ ارادہ کے بعد نیت پر عمل کا دار ومدار ہوتا ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا، أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا، فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ»[1]

"اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، ہر بندے کو وہی ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی ہو، جس نے دنیا کے لیے ہجرت کی اسے وہ مل جائے گی، یا کسی عورت سے نکاح کے لیے ہجرت کی تو وہ اس سے نکاح کرلے گا، تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف ہے جس کی نیت سے ہجرت کی ہو۔"

مزید آپ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد فرمایا:

«لاَ هِجْرَةَ بَعْدَ الفَتْحِ، وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ»[2]

"فتح مکہ کے بعد (دیگر علاقوں سے) ہجرت ختم ہوگئی، لیکن جہاد اور (غلبۂ دین کی) نیت باقی ہے"

عمل کا آغاز ارادہ کے بعد نیت سے ہوتا ہے، اور یہی اس کی قبولیت کا معیار ہے۔ جنگ تبوک میں جب صدقہ کا مطالبہ کیا گیا تو حضرت عمرؓ مال لانے کے اعتبار سے حضرت ابو بکرؓ سے برتر تھے، لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ نیت کے اعتبار سے افضل قرار پائے۔

انبیاء کرام صرف علم اور معرفت کے لیے نہیں آتے، بلکہ وہ انسانوں میں طلب وارادہ پیدا کرنے کی غرض سے تشریف لاتے ہیں۔

توحید کے معنی و مفہوم میں ایک بڑا بگاڑ اہل تصوف نے بھی پیدا کیا ہے، اہل تصوف کا موقف ہے کہ توحید کا اصل مقصود معرفت ہے، نہ کہ عبادت۔ اسے ثابت کرنے کے لیے ایک موضوع روایت کا سہارا لیا جاتا ہے:

«كنت كنزا مخفيا. فأردت أن أعرف فخلقت الخلق فبه عرفوني »[3]

"میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میرا تعارف ہو، لہذا میں نے مخلوق کو پیدا کیا جس کی بدولت میری پہچان ہوئی۔"

---

۱ صحيح البخاري :۱

۲ صحيح البخاري :۲۷۸۳

۳ كشف الخفاء : ۲۰۱٦

امام العجلونیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صوفیا کے کلام میں پائی جاتی ہے جسے نبی ﷺ کی طرف منسوب کرنا جھوٹ ہے، ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ یہ نبی ﷺ کا کلام نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کوئی صحیح یا ضعیف سند ہے۔

المختصر! توحید کے معاملے میں جب علم کے پہلو سے بات ہو گی تب وہ توحید ربوبیت کہلائے گی، خواہ وہ اسماء وصفات کی بحث ہو۔ لیکن جب ان کے مطابق طلب وارادہ کی بات ہو گی تو یہ توحید الوہیت بن جائے گی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات بھی کیفیت قلبی کے اعتبار سے توحید الوہیت کی بحث بن جائے گی۔

ایمان کی بنیاد طلب ہوتی ہے، اسی لیے کہتے ہیں کہ ایمان 'کیفیت' کا نام ہے۔ مجھے یاد ہے کہ شیخ التفسیر حافظ محمد حسین امرتسریؒ اور تایا مرحوم حافظ عبد اللہ (محدث) روپڑیؒ کے درمیان اکثر مذاکرہ و بحث ہوئی کہ فن منطق کے اعتبار سے ایمان مقولہ 'کم' میں سے ہے یا مقولہ 'کیف' میں سے؟ دونوں ہی اس پر متفق ہوئے کہ ایمان 'مقولہ کیف' سے ہے۔ مقولہ کیف کا معنیٰ ہے کہ ایمان اصل میں انسان کی اندرونی کیفیت کا نام ہے۔ جیسے جیسے وہ کیفیت بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے ایمان میں اضافہ اور پختگی آتی جاتی ہے۔ اگر انسان میں ایمانی کیفیت پیدا نہ ہو تو قرآن مجید کی تلاوت، ذکر واذکار اور عبادات کا ثواب اگر مل بھی جائے تب بھی اس کا تربیتی، نفسیاتی اور روحانی فائدہ بہت کم حاصل ہوتا ہے۔ حدیث جبریل میں اسلام اور ایمان دونوں کے امتزاج والی حالت کو 'احسان' کا نام دیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ سے جبریل علیہ السلام نے پوچھا:

احسان کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ»[1]

"تو اس طرح اللہ کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔"

اسی لیے دعا کو عبادت کا اعلیٰ درجہ قرار دیا گیا ہے کہ اس سے انسان میں دوسری عبادات کی نسبت طلب کا زور ہوتا ہے۔ چونکہ اسی طلب کی بڑھوتری اللہ تعالیٰ کو زیادہ مطلوب ہے، دعا کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ﴾ [الفرقان: ۷۷]

"(اے نبی! آپ لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ اگر تم اسے نہ پکارو تو میرے پروردگار کو تمہاری کوئی پروا نہ ہوتی۔"

---

1 صحيح البخاري: ٥٠

مزید حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

﴿ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا ۝ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَلَمْ أَكُن بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝﴾ [مریم: ٢-٤]

"یہ آپ کے پروردگار کی اس رحمت کا ذکر ہے جو اس نے اپنے بندے زکریا پر کی تھی۔ جب زکریا نے اپنے پروردگار کو چپکے چپکے پکارا۔ اور کہا: "میرے پروردگار! میری ہڈیاں بوسیدہ ہو چکیں اور بڑھاپے کی وجہ سے سر کے بال سفید ہو گئے، تاہم اے میرے پروردگار! میں تجھے پکار کر کبھی محروم نہیں رہا۔"

اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں پر دو بنیادی حقوق ہیں (۱) اللہ کی عبادت کرنا (۲) اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا، عبادت سے مراد ہر وہ کام جو کسی کو خوش کرنے کے لیے انجام دیا جائے، چونکہ اللہ سب کا خالق و مالک ہے لہٰذا اسی کا حق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ اللہ کی عبادت کا حق یہ ہے کہ اللہ کے احکام کی پوری طرح بجا آوری کی جائے اور منع کردہ کاموں سے اجتناب کیا جائے۔ اسی لیے عبادت کرنا اور شرک نہ کرنا دو مختلف چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں۔ یعنی شرک نہ کرنا عبادت کرنے کا ہی دوسرا رخ ہے۔ شرک کی موجودگی میں عبادت بے کار اور لاحاصل ہوتی ہے اسی لیے قرآن و حدیث میں عبادت کرنے اور شرک سے اجتناب کو اکٹھا بیان کیا گیا ہے۔

اگر بندہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور شرک سے کلی اجتناب کرے، تو اللہ پر بندے کا یہ حق لازم ہو جاتا ہے کہ اسے عذاب نہ دے، یعنی بخش دے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ حق بندے نے اللہ پر لاگو نہیں کیا، بلکہ خود اللہ نے اپنے اوپر لازم کیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ۝﴾ [الروم: ٤٧]

"اور مومنوں کی مدد کرنا ہمارا حق ہے۔" (یہ تفسیری نکتہ ہے ورنہ اس آیت کے کئی مفاہیم ہیں)

مزید فرمایا: ﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ [الأنعام: ٥٤]

"تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔"

قرآن مجید اور احادیث میں کئی مقامات پر جنت و جہنم، عذاب و مغفرت کو شرک سے ساتھ جوڑ کر بیان کیا گیا ہے۔ یعنی شرک کرنے والا عذاب کا مستحق ہو گا اور شرک سے اجتناب کرنے والا مغفرت اور جنت کا حق دار ہو گا۔

عبادت کی ضد شرک ہے۔ جب انسان معرفت کے باوجود طلب وارادہ کا مستحق اللہ رب العالمین کے سوا کسی دوسرے کو بھی بنالیتا ہے تو وہ عبادت کو بھی منہدم کر دیتا ہے، اس لیے یہ سب سے بڑا گناہ اور جرم ہے۔

قرآن کریم میں ہے:

﴿ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ﴾[الزمر: ٦٥]

"اگر آپ شرک کریں گے تو آپ کے عمل بھی ضائع ہو جائیں گے۔"

مزید فرمایا:

﴿ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝﴾[المائدة: ٧٢]

"حالانکہ مسیح نے تو یہ کہا تھا: "اے بنی اسرائیل! اللہ کی عبادت کرو، جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔"

اور حدیث قدسی میں ہے:

«يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِي بِقُرَابِ الأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيتَنِي لَا تُشْرِكُ بِي شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً»[1].

"(اللہ تعالیٰ نے فرمایا:) اے آدم کے بیٹے! اگر تو زمین برابر بھی گناہ کر بیٹھے اور پھر مجھ سے اس حال میں ملے کہ تو نے میرے ساتھ کسی طرح کا شرک نہ کیا ہو تو میں تیرے پاس اس کے برابر مغفرت لے کر آؤں گا۔ (شرک کے ماسوا دیگر گناہ مشیت الٰہی کے تابع ہوتے ہیں وہ پکڑے یا چھوڑ دے)"

«عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ، مَا الْمُوجِبَتَانِ؟ فَقَالَ: «مَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ» .[2]

---

١ سنن الترمذي: ٣٥٤٠

٢ صحيح مسلم: ٩٣

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے پاس ایک شخص آیا، اور عرض کرنے لگا: اے رسول اللہ ﷺ! وہ کون سی دو چیزیں (جنت اور جہنم کو) واجب کر دینے والی ہیں؟: آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا تھا تو وہ جنت میں داخل ہو گا اور جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرتا تھا تو وہ جہنم میں داخل ہو گا۔"

«عَنِ أَبِيْ ذَرٍّ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: أَتَانِي جِبْرِيلُ فَبَشَّرَنِي أَنَّهُ مَنْ مَاتَ لاَ يُشْرِكُ بِاللَّهِ شَيْئًا دَخَلَ الجَنَّةَ »[1].

"حضرت ابو ذرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے پاس جبرائیلؑ آئے اور مجھے بشارت دی کہ جو شخص اس حال میں مرے گا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا ہو گا تو وہ جنت میں جائے گا۔"

ملاحظہ: مشیت الٰہی کی بحث آگے آ رہی ہے، لہذا بے عملی کی جرأت بڑی خطرناک شے ہے۔ اس کی وضاحت ہم کسی دوسرے موقع پر کریں گے۔ ان شاء اللہ

اہم فوائد

۱. توحید محض معرفت الٰہیہ کا نام نہیں ہے، بلکہ معرفت کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ سے بندے کے تعلق قائم کرنے کا نام ہے۔
۲. معرفت تو محض بنیاد ہے ورنہ اصل مقصود یہ ہے کہ بندے میں طلب و ارادہ پیدا ہو۔
۳. اللہ تعالیٰ کا بندے پر حق یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔
۴. اگر بندہ شرک سے پرہیز کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کے باقی گناہ اپنی رحمت سے معاف کر کے جنت عطا کر سکتے ہیں، لیکن شرک اکبر کسی صورت معاف نہیں ہو گا، اس کی سزا صرف جہنم ہے۔

حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ، حَدَّثَنِي مَالِكٌ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ ابْنِ أَبِي صَعْصَعَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ، أَنَّ رَجُلًا سَمِعَ رَجُلًا يَقْرَأُ

---

۱ صحيح البخاري :٧٤٨٧

{قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ}يُرَدِّدُهَا، فَلَمَّا أَصْبَحَ جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللہ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ لَهُ ذَلِكَ، وَكَأَنَّ الرَّجُلَ يَتَقَالُّهَا ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللہ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، إِنَّهَا لَتَعْدِلُ ثُلُثَ القُرْآنِ »

زَادَ إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ مَالِكٍ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ، أَخْبَرَنِي أَخِي قَتَادَةُ بْنُ النُّعْمَانِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللہ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

''ہمیں اسماعیل بن ابی اویس نے بیان کیا کہ ہمیں امام مالکؒ نے بیان کیا' ان سے عبد الرحمن بن عبد اللہ ابن عبد الرحمن بن ابی صعصعہ نے بیان کیا' ان سے ان کے والد نے اور ان سے حضرت ابو سعید خدریؓ سے بیان کیا کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو (نماز تہجد میں) بار بار قل ھو اللہ احد پڑھتے سنا۔ صبح ہوئی تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس طرح واقعہ بیان کیا گویا وہ اسے ہلکا سمجھ رہا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ سورت تہائی قرآن کے برابر ہے۔''

اسماعیل بن جعفر نے امام مالک سے یہ اضافہ ذکر کیا ہے کہ انہیں عبد الرحمن نے 'اپنے والد سے بیان کیا کہ ابو سعید خدریؓ نے کہا کہ مجھے میرے بھائی قتادہ بن نعمان نے نبی کریم ﷺ سے یہ خبر دی ہے۔

لطائف الاسناد

اس حدیث کو امام بخاریؒ نے دو اسناد سے ذکر کیا ہے، اور دوسری سند میں صرف امام بخاری کے استاذ کا فرق ہے، حسن اتفاق سے دونوں اسناد میں امام بخاریؒ کے دونوں اساتذہ کے نام اسماعیل ہیں، پہلی سند میں إِسْمَاعِيل ابن أبي أويس ہے، جب کہ دوسری سند کے پہلے راوی کا نام اسماعیل بن جعفر ہے اور وہ دونوں ہی امام مالکؒ سے روایت کرتے ہیں، باقی راوی یکساں ہیں۔

پہلی سند میں حضرت ابو سعید خدریؓ 'رجل' کے واسطہ سے نقل کر رہے ہیں، جبکہ دوسری سند میں رجل کی تعیین کر رہے ہیں کہ وہ ان کا اخیافی (ماں جایا) بھائی قتادہ بن نعمانؓ تھا۔

اگر صحابی رجل (مبہم) بیان کرے یا نام ذکر کرے تو دونوں صورتوں روایت صحیح ہوتی ہے بشرطیکہ صحابی ہو کیونکہ صحابہ کلہم عدول ہیں۔ البتہ نام ذکر کرنے سے صراحت ہو جاتی ہے۔

مذکورہ حدیث میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ صاحب واقعہ کون تھا، لیکن دوسری روایت [صحیح بخاری:

۵۰۱۴] میں وضاحت ہے کہ صاحب واقعہ حضرت ابو سعید کے ماں شریک بھائی قتادہ بن نعمان ہیں اور راوی قصہ بھی ہیں۔ نعمان ان سے بڑے اور بدری ہیں۔

حضرت ابو سعید خدریؓ

اس حدیث کے راوی ابو سعید خدریؓ ہیں، جن کا اصل نام سعد بن مالک بن سنان خدری ہے، مدینہ کے رہنے والے ہیں، ہجرت کے وقت ان کی عمر دس برس تھی، آپ کے والد مالک بن سنان صحابی ہیں جو غزوہ احد میں شہید ہوئے۔ آپ جنگ احد میں شامل ہونے کے لیے حاضر ہوئے لیکن کم عمری کے سبب لوٹا دیئے گئے، پہلی مرتبہ آپ کو جنگ خندق میں شرکت کی اجازت ملی، اس کے بعد ہر جنگ میں نبی ﷺ کے ساتھ شریک کار رہے، سن ۷۴ ہجری میں آپ کی وفات ہوئی، اور بقیع میں دفن ہوئے، کثیر الروایۃ صحابہ میں سے ہیں۔

حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ ، حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ صَالِحٍ، حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ، حَدَّثَنَا عَمْرٌو، عَنِ ابْنِ أَبِي هِلاَلٍ ، أَنَّ أَبَا الرِّجَالِ مُحَمَّدَ بْنَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، حَدَّثَهُ عَنْ أُمِّهِ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، وَكَانَتْ فِي حِجْرِ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، عَنْ عَائِشَةَ: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ رَجُلًا عَلَى سَرِيَّةٍ، وَكَانَ يَقْرَأُ لِأَصْحَابِهِ فِي صَلاَتِهِ فَيَخْتِمُ {بِقُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ}، فَلَمَّا رَجَعُوا ذَكَرُوا ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ:«سَلُوهُ لِأَيِّ شَيْءٍ يَصْنَعُ ذَلِكَ؟»، فَسَأَلُوهُ، فَقَالَ: لِأَنَّهَا صِفَةُ الرَّحْمَنِ، وَأَنَا أُحِبُّ أَنْ أَقْرَأَ بِهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَخْبِرُوهُ أَنَّ اللَّهَ يُحِبُّهُ»[1]

"ہمیں محمد نے بیان کیا، کہ ہمیں احمد بن صالح نے بیان کیا کہ ہمیں ابن وہب نے عمرو سے بیان کیا کہ انہیں ابو ہلال نے بیان کیا کہ ابو الرجال محمد بن عبد الرحمن نے 'اپنی والدہ عمرہ بنت عبد الرحمن سے بیان کیا کہ 'وہ ام المؤمنین عائشہؓ کی پرورش میں تھیں۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک صاحب کو ایک مہم پر روانہ کیا۔ وہ صاحب اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھاتے تھے اور نماز میں (قراءت کا اختتام) قل ھو اللہ احد پر کرتے تھے۔ جب لوگ واپس آئے تو اس کا ذکر

١ صحيح البخاري: ٧٣٧٥

آنحضرت ﷺ سے کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ وہ یہ طرز عمل کیوں اختیار کئے ہوئے تھے۔ لوگوں نے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ اس لیے ایسا کرتے تھے کہ یہ اللہ کی صفت ہے اور میں اسے پڑھنا پسند رکھتا ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ انہیں بتادوں کہ اللہ بھی انہیں عزیز رکھتا ہے۔"

لطائف الاسناد

مذکورہ حدیث کی سند میں پہلا راوی محمد چونکہ بغیر کسی نسبت کے ذکر کیا گیا ہے، اس لیے شارحین میں اختلاف ہے کہ یہ محمد کون ہے؟ امام بیہقی وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ محمد بن یحیی الذہلیؒ ہے، اس لیے الاسماعیلی نے المستخرج میں حرملة عن ابن وہب کی روایت میں محمد بن یحیی الذہلیؒ کا نام لکھا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہاں محمد سے مراد امام بخاری ہیں، یعنی صحیح البخاری کو نقل کرنے والے امام بخاری کے شاگرد امام فربریؒ نے اپنے اعتبار سے امام بخاری کا نام لکھ دیا ہے کہ میں نے یہ روایت امام بخاری سے لی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ پوری صحیح بخاری میں ہر جگہ پر احمد بن صالح سے امام بخاریؒ بلاواسطہ نقل کرتے ہیں، کہیں بھی بالواسطہ نقل نہیں کی۔ واللہ اعلم

راویہ حدیث: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

ام المؤمنین سیدہ عائشہؓ، حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیٹی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان سے غزوہ بدر کے بعد سن دو ہجری میں شادی کی۔ ان کے بقول شادی کے وقت ان کی عمر ۹ برس تھی، اس طرح آپ کی پیدائش سنہ ۸ نبوی بنتی ہے۔ آپ بہت بڑی فقیہہ اور عالمہ تھیں، صحابہ کرام مشکل مسائل ان سے حل کراتے تھے۔ حضرت عروہؒ فرماتے ہیں:

«مَا رَأَيْتُ أَحَدًا أَعْلَمَ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ وَالْعِلْمِ وَالشِّعْرِ وَالطِّبِّ مِنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ»[1].

"میں نے ام المؤمنین سیدہ عائشہ سے بڑھ کر حلال و حرام، شعر، طب اور دوسرے علوم کو جاننے والا نہیں دیکھا۔"

---

١ المستدرك على الصحيحين للحاكم (٤/ ١٢):٦٧٣٣

شرح الحدیث

مذکورہ بالا دونوں احادیث لانے کا مقصد اللہ تعالیٰ کا تعارف اور اس کی وحدانیت کی فضیلت بیان کرنا ہے۔
اور یہ بتانا ہے کہ توحید بنیادی اور اعلیٰ ترین علم ہے۔

اور دوسری احادیث میں اللہ تعالیٰ کی صفات سے محبت کرنے اور اس کے اسماء وصفات ذکر کرنے کی فضیلت یہ بتائی گئی کہ جو شخص اللہ کی صفات سے محبت کرتا ہے، اور ان کی تلاوت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

اللہ کی صفات کو ماننا اور ان سے محبت کرنا توحید الوھیت ہے جو جنت میں جانے کا ذریعہ ہے۔

سورۃ الاخلاص میں اللہ تعالیٰ کا مکمل تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس میں اللہ کی وحدانیت، اس کی بے نیازی، رشتہ داری اور ہمسری کی نفی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ حیثیت پیش کی گئی ہے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مشرکین نے کہا: اے محمد! اپنے رب کا نسب بیان کریں، اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔[1]

سورۃ الاخلاص کی فضیلت:

سورۃ الاخلاص اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات جن کی روشنی میں اس کی یکتائی پر زور ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی بلند وبالا ہیں۔ پر مشتمل ہے۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "بعض علماء نے کہا ہے کہ شرک کبھی تعدد کی صورت ہوتا ہے، جس کی لفظ احد کہہ کر نفی کر دی گئی ہے، اور کبھی شرک مرتبہ ومنصب کے اعتبار سے ہوتا ہے، اس کی نفی لفظ صمد سے کی گئی ہے۔ اسی طرح رشتہ داری کی نسبت سے بھی ہوتا ہے، لم یلد و لم یولد کہہ کر اس کی نفی کی گئی ہے۔ اور کبھی شرک کام اور تاثیر میں دخل اندازی سے ہوتا ہے اس کی نفی لفظ ولم یکن له كفوا أحد سے کی گئی ہے۔ توحید کے اسی جامع مضمون کے باعث اس سورت کو "سورۃ الاخلاص" کہا جاتا ہے۔"[2]

مزید اس سورت میں شرک والحاد کے جتنے نظریات دنیا میں موجود ہیں، سب کا رد موجود ہے۔

---

1 المستدرک علی الصحیحین للحاکم (٢/ ٥٤٠) : ٣٩٨٧

2 تفسیر عزیزی، پارہ عم: ٦٨١، از عبد العزیز محدث دھلویؒ۔ ادارہ اسلامیات کراچی

ثلث القرآن کی وجوہات

مذکورہ بالا حدیث میں سورۃ الاخلاص کو ثلث القرآن قرار دیا گیا ہے، اس کی علماء کرام نے کئی توجیہات کی ہیں۔

پہلی توجیہ:

قرآن مجید میں بنیادی طور پر تین مضامین بیان ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کبریائی، عبادات اور معاملات۔ سورۃ الاخلاص ان میں سے توحید کا جامع ترین تعارف ہے، اس لیے اسے ثلث القرآن کہا گیا ہے۔

دوسری توجیہ:

قرآن مجید کے تین حصے ہیں: عقیدہ، قصص کی عبرت ونصیحت، اور شرعی احکام۔ سورۃ الاخلاص ان میں سے عقیدہ والے حصے (توحید) کی تمام جہتوں پر مشتمل ہے، اس لیے اسے ثلث القرآن کہا گیا ہے۔

تیسری توجیہ:

قرآن مجید میں تین عقائد بیان ہوئے ہیں توحید، رسالت، اور آخرت اور سورۃ الاخلاص ان میں سے اہم ترین عقیدہ توحید پر مشتمل ہے۔

چوتھی توجیہ:

قرآن مجید کی بعض آیات کا دوسری آیات پر یک گونہ اضافہ ہوتا ہے، اسی اصول کے مطابق سورۃ الاخلاص ثواب میں تہائی قرآن کے برابر ہے۔ یہ تمام توجیہات اس سورۃ پر صادق آتی ہیں۔

امام بخاریؒ مذکورہ بالا احادیث کو اس باب میں اس لیے لائے ہیں کہ سورۃ اخلاص اللہ تعالیٰ کا تعارف اور توحید کی دیگر اعمالِ خیر پر بالادستی پر مبنی ہے، یعنی یہ توحید خالص کی جامع ترین سورت ہے۔ لہٰذا اسے غور وخوض سے پڑھنا اور اس سے محبت کرنا ایمان کی نشانی ہے۔

فوائد:

۱) سورۃ الاخلاص اللہ تعالیٰ کے تعارف اور اس کی اعلیٰ صفات پر مشتمل ہے۔

۲) اللہ تعالیٰ کی صفات سے محبت اللہ کی ذات سے محبت کی بنا پر ہی ہوتی ہے، گویا بندہ کا اللہ کی ذات و صفات سے محبت کرنا محبت ربانی کے حصول کا سبب ہے۔

۳) اللہ تعالیٰ کی کلام سے خالص محبت کا بدلہ اللہ تعالیٰ اس سے بڑھ کر دیتے ہیں۔

۴) اس میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کے مرجع محبت کا اثبات ہے۔

۵) سورۃ الاخلاص 'ثلث قرآن' کے برابر اجر کی حامل ہے۔
۶) نماز میں بار بار ایک ہی سورت بھی پڑھی جاسکتی ہے۔
۷) قرآن کا کوئی حصہ بیک وقت تکرار سے پڑھا جاسکتا ہے۔
۸) ایک ہی رکعت میں مختلف مقامات سے قرآن پڑھا جاسکتا ہے۔
۹) صحابہ کرام نے اپنے امام کے ایک عمل کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس سے پوچھ کر آؤ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ لہذا جب کسی مفتی سے کسی شخص کے عمل کی بابت نسبت فتویٰ پوچھا جائے تو وہ جلد بازی نہ کرے، بلکہ عمل کرنے والے کا نقطہ نظر ضرور جانے، پھر فتویٰ دے۔

حافظ عبد الرؤف بن عبد الحنان سندھو کا سانحہ ارتحال

حافظ عبد الرؤف بن عبد الحنان سندھوؒ ۱۸ جولائی ۱۹۵۶ کو گاؤں سندھو کلاں میں پیدا ہوئے، ان کے دادا مرحوم مولانا محمد اشرف سندھو اپنے وقت کے عظیم عالم اور اعلیٰ پائے کے مصنف تھے۔ بیٹے اور پوتے نے اس روایت کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ آپ نے پتوکی کے قریب گاؤں 'پارو کی' میں قرآن مجید حفظ کیا، پھر الجامعۃ الاسلامیہ اور جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں درس نظامی کیا، دوران تعلیم ہی مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا۔ وہاں سے فراغت کے بعد پہلے شارجہ پھر کویت میں دعوت و ارشاد اور تصنیف و تحقیق کے شعبوں سے وابستہ رہے۔ آپ کی اکثر تصانیف عربی زبان میں اور تحقیقی انداز کی ہے جو عرب ممالک میں شائع ہو کر علماء سے داد تحسین وصول کر چکی ہیں۔ حافظ صاحب کویت ہی میں تھے کہ بیماری نے آلیا، ابتدائی علاج معالجہ کرایا مگر دل مطمئن نہ ہوا تو بچوں سمیت پاکستان تشریف لے آئے، ۸ اگست کو طبیعت زیادہ بگڑ گئی، تو لاہور C.M.H میں لایا گیا، تشخیص سے پتہ چلا کہ خطرناک قسم کا بلڈ کینسر ہے۔ چار پانچ دن نیم بیہوشی میں رہنے کے بعد ۱۴ اگست ۲۰۲۲ء بروز اتوار عشا کے وقت اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ نے اپنے رفقا کے ساتھ جنازے میں شرکت فرمائی۔

ادارہ محدث ان کے ورثاء اور جماعت کے غم میں برابر شریک ہے۔ (محدث)

عقیدہ وعمل میں سلفی / اہل حدیث کے امتیازات

ڈاکٹر آصف جاوید

برصغیر پاک وہند میں ایک مذہبی فرقہ 'اہل حدیث' کہلاتا ہے اور عقیدہ وعمل کے میدان میں دورِ تقلید سے قبل کے ائمہ سلف سے منسوب ہو کر 'سلفی' لقب کا دعویدار بھی ہے۔ 'محدث' کی مجلس تحریر کے ایک رکن ڈاکٹر آصف جاوید کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ بھی اسی موضوع پر ہے۔ ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ نفاذ شریعت کی راہ میں مذہبی فرقہ بندی کو بہت بڑی رکاوٹ سمجھتا ہے جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کا حلقہ علم اور مولانا داؤد غزنویؒ وغیرہ کا زور اہل حدیث کے ملت اسلامیہ کے نمائندہ مکتب فکر ہونے کا تھا اور بقول مولانا عطاء اللہ حنیفؒ مولانا محمد اسمعیل سلفیؒ کو فکری طور پر اس موضوع پر مولانا داؤد غزنویؒ سے کئی دفعہ مباحثہ بھی کرتے سنا گیا۔ برصغیر کے اہل حدیث تنظیمی طور پر عموماً عوام ہیں جبکہ ائمہ سلف کے اختلافات اہل علم کے تھے۔ ادارہ نے مقالہ مذکورہ کا یہ حصہ اس لیے شائع کیا ہے کہ علمائے اہل حدیث کی تازہ آراء بھی سامنے آجائیں کیونکہ بلاد خلیج میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ فقہی مکاتب فکر بھی عقیدہ میں 'سلفی' کہلاتے ہیں۔ اہل حدیث کے تاریخی ارتقاء پر وقیع تجزیوں کی روشنی میں ہی 'محدث' اہل حدیث کے روشن مستقبل پر اصلاحی تجاویز دینا چاہتا ہے۔ لہٰذا اہل حدیث علم وقلم کو کتاب وسنت کی حدود میں آزادانہ شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ (محدث)

رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے ابتدائی قرون ثلاثہ کو بہترین قرار دیا ہے [1]۔ اس زمانہ مبارک میں اہل کلام، اہل سنت، اہل حدیث، اہل رائے نام کا کوئی گروہ موجود نہ تھا بلکہ تمام کے تمام لوگ اہل اسلام ہی تھے جو عقیدہ وعمل کے باب میں کتاب وسنت پر عمل کرتے تھے۔

آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ اس وقت تک قیامت قائم نہ ہو گی جب تک میری امت گزرے لوگوں کی روش اختیار نہ کرے گی [2]۔ آپ کے فرمودات کے عین مطابق امت میں اختلاف وافتراق کی بنا پر مختلف فرقے وجود میں آئے، جن میں سے بعض کی بنیاد سیاسی نزاع اور بعض کی بنیاد مذہبی اختلاف تھا۔ سیاسی نزاع

---

۱ صحیح البخاری ، کتاب فضائل الصحابة ، باب فضائل أصحاب النبی : ۳٤٥٠

۲ صحیح البخاری ، کتاب الأنبیاء ، باب ما ذکر عن بنی إسرائیل : ۳۲٦۹

بعد میں اگرچہ مذہبی رنگ اختیار کر گیا اور اصل مسئلہ کو گڈ مڈ کر دیا گیا۔ اسی سیاسی نزاع کی بنیاد پر عثمانی وسبائی اور خوارج وروافض کا وجود عمل میں آیا جبکہ مذہبی اختلاف کی بنا پر قدریہ، جہمیہ، معتزلہ اور مرجئہ کے فرق وجود میں آئے۔ مذکورہ مذہبی فرقوں میں سے بعض فرقے کسی دوسرے کا رد عمل ہیں اور اپنے اصول کے لحاظ سے اس کی ضد میں واقع ہوئے ہیں چنانچہ خوارج کی ضد روافض ہے، قدریہ کی ضد جبریہ ہیں، معتزلہ کی ضد مجسمہ ہیں اور مرجئہ کی ضد وعیدیہ ہیں۔

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ رقم فرما ہیں:

"ان سب کے پیدا ہو جانے کی جامع وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اپنے خیالات و قیاسات کو داخل شریعت کیا اور اس طریق کو ملحوظ نہ رکھا جس پر آں حضرتؐ نے اپنی پاک جماعت؛ صحابہ کرامؓ کو چھوڑا تھا اور وہ صدر اول سے ان کے اوقات تک برابر متوارث چلا آرہا تھا۔"[1]

تاریخ اسلام میں جس فکر نے سادہ اسلامی فکر کو انتہائی متاثر کیا، وہ اعتزالی فکر ہے، جس کا آغاز ۱۰۰ ہجری کے گرد و پیش ہو گیا تھا جب حضرت حسن بصریؒ سے کسی نے عرض کیا کہ خوارج کے نزدیک کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے اور مرجئہ کے نزدیک گناہ کسی مومن کو مطلقاً کوئی ضرر نہیں دیتا، آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ ابھی آپ خاموش ہی تھے کہ آپ کے تلامذہ میں سے ایک شخص واصل بن عطا گویا ہوا کہ مرتکب کبیرہ کا حکم ان کے بین بین ہے نہ ہی وہ مومن ہے اور نہ ہی کافر ہے۔ واصل یہ کہتے ہوئے ایک ستون کے پاس چلا گیا جس پر آپؒ نے فرمایا:

اعتزل عنا الواصل[2]

"واصل ہم سے الگ ہو گیا ہے۔"

واصل نے بعد میں اپنے عقائد و نظریات کا پرچار شروع کر دیا اور معتزلہ کا بانی قرار پایا۔ فکر اعتزال کو اصل فروغ عباسی خلیفہ مامون کے عہد (۱۹۸ تا ۲۱۸ھ) میں حاصل ہوا، جب اس نے یونانی علوم کا عربی میں ترجمہ کروایا جس سے فلسفہ یونان مسلمانوں میں بھی عام ہو گیا، بعض لوگ اس سے متاثر ہو کر عقائد اسلامی پر آزادانہ

---

۱ تاریخ اہل حدیث، ص ۲۴

۲ الشهرستاني، الملل والنحل ۱/۴۸

گفتگو کرنے لگے۔ معتزلہ کے پیشوا ابوہذیل علاف اور ابراہیم نظام کو مجلس مناظرہ کا سرخیل ہونے کا شرف حاصل تھا۔ یہ انہی کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا کہ مامون کے ذہن میں بھی خلق قرآن کا عقیدہ بیٹھ گیا اور اس نے جبر و تشدد کے بل پر اسے منوانا شروع کر دیا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق بلند کیا اور عقیدہ خلق قرآن سے انکار کر دیا۔ فتنہ کے اس دور تک امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا انتقال ہو چکا تھا چنانچہ امام احمدؒ کو امام اہل سنت کا لقب دیا گیا۔

ابتدائی اہل اسلام نام کے اعتبار سے اگرچہ اہل سنت نہ تھے مگر فکری اور معنوی طور پر ان کے پاس سنت رسول کا متعین پیمانہ موجود تھا اور وہ اسی پر کاربند تھے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ رقم کرتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں گو اہل سنت کا لفظ بحیثیت لقب نہ تھا مگر بحیثیت معنی کے سب صحابہ کرامؓ اہل سنت تھے۔ اہل سنت کے اضافی معنی صاف ہیں: سنت والا۔ یعنی وہ شخص یا فرقہ جس کو ہر مذہبی کلام میں سنت نبویہ ملحوظ ہو... جو فرقہ صرف اس وحی الٰہی کو دستور العمل بنائے گا، جس کو آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ نے بنایا وہ فرقہ اہل سنت ہے۔"[1]

آپؐ نے حضرات صحابہ کرامؓ کو اپنی سنت کی اتباع کا حکم دے رکھا تھا اور ساتھ ہی خلفائے راشدین کی سنت سے تمسک کا حکم بھی ارشاد فرمایا تھا کہ ان کا جاری کردہ عمل بھی قابل اتباع ہوگا اور اس سے انحراف کرنا جائز نہ ہوگا[2]۔ لہٰذا جو گروہ سنت رسولؐ کے ساتھ ساتھ سنت خلفائے راشدین یا عمل صحابہ کرامؓ کی بات کرے گا، وہ اہل سنت قرار پائے گا جسے آپؐ نے حدیث میں ناجی فرقہ سے تعبیر کیا ہے اور ما انا علیه و اصحابی کو اس کا پیمانہ قرار دیا ہے۔ ما انا علیه و اصحابی کا فلسفہ کیا ہے؟ اس میں اضافت کیسی ہے؟ اور اس کا مقصد کیا ہے؟ اہل حدیث فکر کی رو سے اس میں صحابہ کرام کو عزت دینا مقصود نہیں ہے بلکہ ان کی روش کو نجات کا ضامن قرار دینا مقصود ہے۔ حافظ عبداللہ محدث روپڑیؒ رقم فرماتے ہیں:

"معطوف اور معطوف علیہ دونوں ناجی فرقہ کی علامت ہے کیونکہ دونوں ناجی فرقہ کی علامت کے سوال کے جواب میں واقع ہوئے ہیں...... رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھا کہ فرقہ بندیوں کے وقت وحی الٰہی کو

---

۱ ہفت روزہ، اہل حدیث، امرتسر، ۲۸ فروری ۱۹۱۹ء، ص ۱۹

۲ سنن أبي داود، كتاب السنة باب في لزوم السنة، (٤،٠٠٢) :٤٦٠٧

سمجھنے میں لوگ کھینچا تانی کریں گے اس لیے ساتھ صحابہ کو شامل کر دیا۔ پس جو شخص تفسیر یا فتوی میں صحابہ کی جماعت سے الگ ہو جائے وہ وحی کا متبع نہیں ہے اور جو وحی کا متبع نہیں، وہ ناجی نہیں ہو سکتا۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کی احادیث و سنن کی صحیح بنیادوں پر تفہیم کے لیے صحابہ کرامؓ کے فہم کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے وگرنہ گمراہی کا شکار ہونا یقینی ہو گا۔ یہی باعث ہے کہ اہل حدیث کے نزدیک 'اہل السنۃ والجماعۃ' کی ترکیب میں 'السنۃ' سے مراد اتباعِ حدیث اور 'الجماعۃ' کی قید سے جماعت صحابہ کی روش مراد ہے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ رقم فرماتے ہیں:

''اہل سنت اس جماعتِ حقہ کا نام ہے جو بلا کم و کاست مطابق اقوال و افعال رسولؐ اور مطابق اقوال و افعال صحابہ کرامؓ کے عمل کرتی ہے۔ اقوال و افعال رسول سے تو گریز نہیں لیکن اقوال و افعال صحابہ کرامؓ اس لیے کہ انہی حضرات کے راہ حق پر چلنے کی دعا ہر نماز پنجگانہ میں کی جاتی ہے: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ اور جس کی تفصیل ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ﴾ میں موجود ہے۔''[2]

اہل سنت اور اہل بدعت

قرن اول کے نصف ثانی میں اپنے فضائل و مناقب اور مخالف کے عیوب و نقائص ثابت کرنے کی غرض سے مختلف فرقوں خصوصاً خوارج و روافض نے وضع حدیث کا سلسلہ شروع کر دیا تھا چنانچہ ان کے خود ساختہ عقائد و اعمال کی بنا پر علمائے اہل سنت نے انہیں اہل بدعت قرار دیا اور حدیث کی نقل و روایت میں اہل بدعت سے خبر دار رہنے کا اسنادی طریقہ کار اختیار کیا۔ صحیح مسلم کے مقدمہ میں امام صاحبؒ نے اپنی اسناد کے ساتھ محمد بن سیرینؒ تابعی سے روایت کیا ہے:

« لم يكونوا يسألون عن الاسناد فلما وقعت الفتنة قالوا سموا لنا رجالكم فينظر الى اهل السنة فيوخذ حديثهم فينظر الى اهل البدع فلا يوخذ حديثه »[3]

''آغاز میں لوگ راوی سے اسناد کے متعلق سوال نہیں کرتے تھے پھر جب فتنہ رونما ہوا تو لوگ کہتے

1. اہل سنت کی تعریف از محدث روپڑیؒ، ص ۶۵، ۶۶
2. ہفت روزہ، اہل حدیث، امرتسر، ۲ مئی ۱۹۱۹ء، ص ۲۰
3. مقدمة صحيح مسلم، ۱۱

اپنے راویوں کے نام پیش کرو پھر وہ دیکھتا اگر وہ اہل سنت سے ہوتا تو اس کی حدیث لے لیتا اور اگر وہ اہل بدعت سے ہوتا تو ان کی حدیث نہیں لیتا تھا"

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل سنت اور اہل بدعت کا کلمہ ابن سیرینؒ کی وفات ۱۱۰ھ سے بھی پہلے مستعمل تھا چنانچہ انہوں نے ماقبل علماء یا اپنے معاصرین کا نکتہ نگاہ 'قالوا' سے بیان فرمایا۔ دوسرا اہل سنت اور اہل حدیث کی اصطلاحات بالمقابل استعمال کی گئی ہیں، عقائد کی یہ تفریق بعد میں عمل میں بھی ڈھلتی چلی گئی۔

چنانچہ عقائد و اعمال کے جن مباحث پر قرآن کریم نے کلام نہیں کیا، جن پر رسول اللہ ﷺ نے کچھ ارشاد نہیں فرمایا اور جن کے متعلق عہد صحابہ سے کچھ منقول نہیں ہوا، انہیں کلامی انداز میں ثابت کرنا یا ان کا دفاع کرنا یا کسی حیثیت سے ان میں مشغول ہونا امام اہل سنت حضرت احمد بن حنبلؒ کے نزدیک بدعت ہے۔ شیخ عبد القادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

« وانما كفر القائل بخلق القرآن وبدع الاخر كان مذهبه رحمه الله، على ان القرآن اذا لم ينطلق بشيء ولا يروى في السنة عن رسول الله صلي الله عليه وسلم و انقرض عصر الصحابة ولم ينقل احد منهم قولا فلقول فيه بدعة و حدثه »[1]

اہل سنت اور اصحاب تاویل

امام اہل سنت حضرت احمد بن حنبلؒ نے معتزلہ کا خوب مقابلہ کیا تھا چنانچہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب معتزلہ کے کیمپ میں سے بعض حضرات نے اہل سنت کا مذہب اختیار کیا اور فلسفی استدلال کی بنا پر اہل سنت کا دفاع اور اہل بدعت کا رد شروع کر دیا مگر علوم شریعت میں ان کی بنیادیں پختہ نہ تھیں یہی باعث ہے کہ گمراہ فرق کے مقابلہ میں انہوں نے بھی تاویل کا ارتکاب کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل سنت میں فلسفی طرز استدلال کا رواج ہو گیا اور تاویل ایک مستقل مذہب بن کر رہ گیا۔

اس مقام پر مسئلہ صفات کے باب میں اہل سنت کے دو گروہ ہوئے ہیں: مفوضین اور مؤولین۔ مفوضین سے مراد وہ حضرات ہیں جو صفات الٰہی کو ان کے ظاہر پر جاری کرتے ہیں اور ان کی کیفیت بیان نہیں کرتے بلکہ بلا کیف ہی ان پر ایمان لاتے ہیں۔ اہل سنت میں سے حنابلہ اور اہل حدیث بھی اسی کے قائل ہیں۔ مؤولین سے

---

۱ غنية الطالبين، مترجم، نعمانی کتب خانہ لاہور

مراد وہ حضرات ہیں جو صفات الٰہی میں کسی قسم کی تاویل کرتے ہیں۔ صفات میں تاویل کرنا جمہور متکلمین کا مذہب ہے، اہل سنت میں سے اشاعرہ اور ماتریدیہ کا شمار بھی اصحاب تاویل یا ارباب کلام میں ہوتا ہے۔

مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رقم فرماتے ہیں:

"علماء کی وہ جماعت بھی متکلمین کہلاتی ہے، جو عقائد کے مسائل میں امام ابو الحسن علی بن اسماعیل الاشعریؒ اور علامہ ابو منصور محمد بن محمد الماتریدیؒ کے مکاتب فکر سے متعلق ہیں۔ اکثر شوافع اور مالکی اول الذکر سے اور حنفیہ ثانی الذکر سے منسلک ہیں، چند مسائل میں دونوں کا اختلاف ہے اور اکثر میں متفق ہیں۔ اہل حدیث ان دونوں سے بہت سے امور میں الگ ہیں۔ یہ تینوں گروہ اہل السنۃ والجماعۃ ہی ہیں۔"[1]

اشاعرہ کے بانی ابو الحسن اسماعیل بن علیؒ ہیں۔ آپؒ کا نسب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے جاملتا ہے۔ آپؒ نے معتزلی استاد ابو علی جبائی سے کسب فیض کیا تھا مگر ان سے الگ ہو کر اہل سنت کا طریقہ اختیار فرمایا۔ آپ کے پاس علم حدیث کا ذخیرہ کم تھا، طریق بیان عقلی تھا اور کچھ نہ کچھ اعتزالی اثر باقی رہ گیا تھا۔ جس کے باعث اہل سنت میں بھی علم کلام مقبول ہونا شروع ہوا۔[2]

صلاح الدین ایوبیؒ فروع میں شافعی اور اصول میں اشعری تھے۔ آپ نے مصر میں شیعہ ازم کا خاتمہ کر کے شافعی اشعری طریق رائج کر دیا، جس سے اشعری مذہب نے دیار مصر میں خوب فروغ پایا۔ دوسری جانب بلاد مغرب میں امام غزالیؒ کا شاگرد محمد بن تومرت ہوا ہے، جس کی وفات پر اس کے شاگرد عبد المومن نے بلاد مغرب پر قبضہ کیا اور اشعری طریق کو بزور شائع کر دیا یہی وجہ ہے کہ عقائد کے باب میں شوافع کی اکثریت اشعری واقع ہوئی ہے۔[3]

ماتریدیہ کے بانی ابو منصور محمدؒ ہیں۔ جو سمر قند کے ماترید نامی محلہ میں پیدا ہوئے۔ آپ فقہ کے باب میں حنفی بلکہ تین واسطوں سے امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ہیں۔ آپ نے قاضی ابو بکر جوزجانیؒ سے علم فقہ سیکھا تھا، انہوں

---

۱ حاشیہ، اصول تفسیر لابن تیمیہ، مترجم (المکتبۃ السلفیۃ، لاہور، جون ۱۹۸۲ء) ص:۵۹

۲ منهاج السنه، ۳،۲۰۵

۳ الاشاعرة فی میزان اهل السنة، المبرة الخيرة لعلوم القرآن والسنة، دولة الكويت، ١٤٢٨هـ

نے ابو سلیمان جوزجانیؒ سے پڑھا اور انہوں نے امام محمدؒ سے کسب فیض کیا تھا جو امام ابو حنیفہؒ کے تلمیذ رشید ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احناف کی اکثریت عقائد کے باب میں ماتریدیہ واقع ہوئی ہے۔ امام ماتریدیؒ کا طریق بیان اور صورت استدلال چونکہ فلسفی تھا لہٰذا آپ نے امام اشعری سے اختلاف کیا اور معتزلہ، قرامطہ اور روافض کا رد کیا اور ایک الگ طریقہ کا بانی قرار پایا۔ شافعیہ اور مالکیہ میں سے اکثریت عقائد میں اشعری اور بعض حنبلی ہیں۔[1]

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقائد کے باب میں اشاعرہ اور ماتریدیہ کا اختلاف ہے، اختلافی مسائل کی تعداد ایک درجن کے قریب تھی مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ اختلاف بڑھتا گیا ہے تاہم اس کا دائرہ کار صفات میں تاویل ہی سے متعلق تھا، اشاعرہ کی نسبت ماتریدیہ میں زیادہ تاویل پائی جاتی ہے۔ حنابلہ کا اشاعرہ سے کل چار مسائل میں اختلاف ہے۔ مثلاً صفات کا اثبات، رؤیت کا اثبات، تقدیر کا اثبات اور خلق قرآن کا مسئلہ۔[2]

مولانا بھوجیانیؒ کے مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اشاعرہ وماتریدیہ بھی اہل سنت میں شمار ہوتے ہیں مگر عام اہل حدیث فکر یہ ہے کہ مؤولین (اشاعرہ اور ماتریدیہ) کو مجموعی حیثیت سے نہ ہی اہل سنت میں شامل کیا جائے گا اور نہ ہی انہیں اہل سنت سے خارج قرار دیا جائے گا۔

حافظ عبد اللہ محدث روپڑیؒ رقم طراز ہیں:

> ”مؤولین کے اہل سنت ہونے میں علماء کا اختلاف ہے، کوئی ان کو اہل سنت سے خارج کرتا ہے اور کوئی داخل۔ لیکن بہتر صورت یہ ہے کہ نہ علی العموم خارج کہنا ٹھیک ہے اور نہ داخل۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ ان کے حال سے تفتیش کی جائے جیسا معلوم ہو ویسا حکم لگایا جائے اور جس کی بابت تردد ہو، اس کا معاملہ خدا کے سپرد کر کے {تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ} پڑھی جائے۔“[3]

اہل سنت اور اہل حدیث

اہل حدیث کے خیال میں نسبت رسول اور حجت شرعی کے اعتبار سے حدیث وسنت باہم مترادف ہیں، اسی لیے اہل حدیث کے نزدیک اضافی مفہوم کے لحاظ سے اہل سنت اور اہل حدیث کا مصداق ایک ہی ہے۔ امام اہل

---

1. الماتريدية دراسة و تقويما، دارالعاصمة، للنشر والتوزيع، النشرة الاولى، ١٤١٣هـ
2. كتاب الاسماء والصفات للبيهقى ، داراحياء التراث العربى، بيروت، لبنان،
3. اہل حدیث کی تعریف، ۴۸

سنت حضرت احمد بن حنبلؒ نے بھی انہیں مترادف کے طور پر استعمال کیا ہے۔ آپ نے رقم فرمایا:

« وهذا مذهب اهل العلم و اصحاب الاثر ، اهل السنة المتمسكين بعروتها المعروفين به المقتدى بهم فيها من لدن اصحاب النبى صلي الله عليه وسلم الى يومنا هذا - وادركت من علماء الحجاز والشام وغيرهم عليها»[1]

مذکورہ اقتباس کا مفہوم یہ ہے کہ امام صاحبؒ نے اہل علم اور اہل حدیث کا مذہب بیان کیا ہے جو درحقیقت اہل سنت ہی ہیں۔ یہ وہ گروہ ہے جو حدیث و سنت کا کڑا تھامنے والا ہے اور یہی ان کی پہچان ہے۔ یہ لوگ عہد صحابہؓ سے لے کر آج تک حدیث و سنت کے باب میں پیشوا رہے ہیں اور امام صاحبؒ نے علماء حجاز وشام کو اسی عقیدے پر کاربند پایا تھا۔

امام اہل سنتؒ کی وفات کے قریبا ایک صدی بعد معتزلہ سے متاثرہ بعض اہل سنت نے بھی مسئلہ صفات کے اثبات و دفاع میں فلسفی طرز استدلال اختیار کیا جس نے معتزلہ کی بنیادیں اگرچہ کھوکھلی کر دیں تاہم خود اہل سنت میں بھی اصحاب تاویل کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جو اشاعرہ اور ماتریدیہ کی شکل میں سامنے آیا۔ ان کے ساتھ ساتھ اہل سنت میں سے ایک گروہ ایسا بھی موجود رہا ہے جس نے قدیم کلامی افکار کی مانند جدید کلامی مباحث سے دامن کشاں رہنا ہی مناسب سمجھا، اس گروہ کو اہل حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اہل حدیث فکر کی رو سے اہل سنت اور اہل حدیث ایک ہی حقیقت کا اظہار ہیں۔ مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ رقم فرماتے ہیں:

"ان ہر دو نبرد آزما جماعتوں (اشاعرہ وماتریدہ) کے مقابلہ میں ایسے لوگ بھی چلے آئے ہیں، جنہوں نے اس نئے علم کلام میں بھی حصہ نہ لیا جس طرح انہوں نے معتزلیوں کے علم کلام میں نہ لیا تھا... وہ عقائد و اصول میں بھی روایات صحیحہ کی بنا پر قرآن وحدیث کے بیان اور جماعت صحابہ کے مسلمات پر قائم رہے... یہ محدثین کا گروہ تھا اور ان کے سرخیل، امام اشعریؒ اور امام ماتریدیؒ سے بہت پیشتر امام احمد بن محمد بن حنبلؒ تھے۔"[2]

امام اشعریؒ کا سن وفات ۳۳۰ ہجری اور امام ماتریدیؒ کا سن وفات ۳۳۵ ہجری ہے جبکہ امام احمد بن حنبلؒ کا

---

۱ عقيدة اهل السنة: ۳

۲ تاریخ اہل حدیث، ۶۲

انتقال قریباایک صدی پیشتر ۲۴۱ہجری میں ہو چکا تھا۔

مذکورہ مقدس گروہ نے قرآن کریم میں بھی مخالفین کا مقابلہ کیا اور انہیں مسکت جواب دیا ہے مگر اس میں تکلف یا تصنع کبھی نہیں اٹھایا چنانچہ اہل اسلام کو بھی اپنے عقائد واصول کے دفاع میں سادہ روی سے ہی کلام کرنا چاہیے اور اس میں عقل وفلسفہ کو دخل نہیں دینا چاہیے یہی باعث ہے کہ وہ اصول وفروع میں کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ حدیث رسول کی اتباع اور عمل صحابہ کی روش پر گامزن رہے ہیں۔ انہی حضرات کو اہل سنت کا نام دیا گیا اور اسی گروہ کو اہل حدیث سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

« واما اهل الحديث والسنة والجماعة فقد اختصوا باتباع الكتاب والسنة الثابتة عن نبيهم صلي الله عليه وسلم فى الاصول والفروع و ما كان عليه اصحاب رسول الله صلي الله عليه وسلم »[1]

اہل سنت کو اس باعث اہل حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ حدیث وسنت باہم مترادف ہیں۔ اس تعبیر کا دوسرا معقول سبب یہ بھی ہے کہ حدیث کا لفظ سنت سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے جو سنت رسول کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کو بھی شامل ہے چنانچہ قرآن وحدیث کے عاملین کو اہل حدیث کا نام دیا گیا ہے۔

مولانا محمد یحییٰ گوندلویؒ رقم کرتے ہیں:

> "اہل سنت اور اہل حدیث دونوں ایک ہی نام ہیں۔ اہل حدیث نام رکھنے کی ایک معقول وجہ یہ تھی کہ حدیث کا لفظ قرآن وحدیث پر مشترک بولا جاتا ہے... جس طرح قرآن پر لفظ حدیث کا اطلاق ہوتا ہے، اسی طرح فرمان رسول پر بھی لفظ حدیث کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اہل حدیث کا معنی ہے: قرآن وحدیث پر عمل کرنے والا۔"[2]

اس مقام پر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اہل سنت کا لقب اصلاً عقائد واصول کے باب میں اور اہل حدیث کا نام عموماً فقہ واجتہاد کے باب میں استعمال ہوتا ہے۔ گویا اہل سنت کا لقب عملی مصداق کے اعتبار سے اہل حدیث کی نسبت زیادہ وسیع ہے جس میں اہل بدعت کے علاوہ اہل سنت کے تمام مکاتب فکر شامل ہوتے

---

۱ منهاج السنة ، ۲،۱۰۳

۲ عقیدہ اہل حدیث (مکتبہ اسلامیہ، لاہور اکتوبر ۲۰۱۰ء)، ۳۹-۴۱

ہیں؟اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اہل حدیث کے نزدیک عقیدہ کو عمل سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے نہ عمل کو عقیدہ سے الگ رکھا جاسکتا ہے لہذا جس طرح اہل سنت کا دائرہ کار عقائد واصول کے ساتھ ساتھ فقہ وعمل پر مشتمل ہے، اسی طرح اہل حدیث کا دائرہ کار فقہ وعمل تک محدود یا عقائد واصول سے خارج نہیں ہے۔

حافظ عبداللہ محدث روپڑیؒ رقم فرماتے ہیں:

"اصل اہل سنت اہل حدیث ہی ہیں کیونکہ اہل سنت دراصل وہ ہے جو ہر طرح سے سنت سے تعلق رکھے یعنی اصول، فروع، عقائد، احکام میں ہر طرح سنت کے پابند رہے جیسے صحابہ کرامؓ کا طرز عمل تھا۔ جو تھوڑا سا بھی اس طرز عمل سے ہٹا، وہ اصلی اہل سنت کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔..پس ثابت ہوا ہے کہ اصلی اہل سنت اہل حدیث ہیں۔"[1]

اہل حدیث فکر کی رو سے دعوائے محض کی بنیاد پر کسی شخص کو اہل سنت قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ دیکھا جائے گا کہ اس کا عمل اپنے دعوی کو کس حد تک ثابت کرتا ہے۔ جو شخص اپنے عمل کی بنیاد حدیث وسنت پر رکھے گا، وہی اہل حدیث ہوگا اور اسی کو اہل سنت قرار دیا جائے گا۔ جس کا عمل حدیث وسنت کے خلاف ہوگا، وہ اہل سنت میں نہیں بلکہ اہل بدعت میں شمار ہوگا۔ مولانا عبدالسلام مبارک پوریؒ رقم فرماتے ہیں:

"اہل حدیث اور اہل سنت دونوں کا مصداق ایک ہے۔ پس جو سنت رسول کا پابند اور جماعت صحابہ کا پیرو ہو، وہی اہل حدیث ہے اور اسی کو اہل السنۃ والجماعۃ کہتے ہیں۔ جو عملاً اہل حدیث ہے، وہی عملاً اہل السنۃ والجماعۃ ہے اور جو زبانی اہل السنۃ والجماعۃ بنتا ہے اور اس کا عمل سنت رسول اور سیرت صحابہؓ اور سبیل صحابہ کے خلاف ہے، وہ کبھی اہل السنۃ والجماعۃ نہیں ہے۔"[2]

اہل حدیث اور محدثین

اصول حدیث اور اسماء رجال کی کتب میں اہل حدیث کا اطلاق عموماً محدثین پر ہوتا ہے، جس سے بعض حضرات کو مغالطہ ہوا ہے کہ اہل حدیث سے ہمیشہ محدثین ہی مراد ہوتے ہیں اور یہ کوئی مستقل مکتبِ فکر نہیں ہے حالانکہ حدیث وفقہ کی کتب متون وشروح میں اہل حدیث کا اطلاق ایک مکتبِ فکر پر بھی ہوا ہے۔ اس غلط

۱ اہل حدیث کی تعریف، ۴۷

۲ ہفت روزہ، اہل حدیث، امرت سر، ص۸، ۳۰ جنوری ۱۹۲۰ء

فہمی کا بنیادی سبب یہ تھا کہ کتب رجال کے اہل حدیث سے کتب فقہ کا اہل حدیث سمجھا گیا وگرنہ اہل سنت کے تمام مکاتب فکر میں سے جن قدسی نفوس نے فنی اعتبار سے حدیث و سنت کی خدمت کا فریضہ سرانجام دیا ہے انہیں کتب رجال کے استعمال میں اہل حدیث قرار دینا درست ہے خواہ وہ اپنے فقہی مکتبِ فکر کی رو سے اہل حدیث نہ بھی ہوں۔ مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ نے رقم کیا ہے:

"اہل حدیث کا لفظ فن حدیث کے خدام پر بھی بولا جاتا ہے، اس لحاظ سے اہل حدیث اور محدث مترادف ہیں۔ یہ خدمت تو ظاہر ہے کہ اہل سنت کے تمام مکاتب فکر نے انجام دی ہے: احناف، شوافع، حنابلہ، موالک، یہ سب حضرات سنت کو حجت مانتے ہیں اس لیے قدرتی بات ہے کہ وہ سنت کی خدمت کریں گے: حافظ طحاویؒ، علامہ عینیؒ، شیخ نابغیؒ، علامہ ترکمانیؒ اور حافظ زیلعیؒ کی فنی خدمات کو کون نظر انداز کر سکتا ہے؟ اس معنی سے یہ لوگ اہل حدیث بھی ہیں اور محدث بھی۔ اہل سنت کے تمام مکاتب فکر سے جن اہل علم نے حدیث کی خدمت بلحاظ فن کی ہے، وہ اہل حدیث ہیں۔"[1]

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل سنت کے تمام مکاتب فکر نے فنی اعتبار سے خدمت حدیث کا فریضہ اپنی اپنی بساط کے مطابق انجام دیا ہے لہٰذا موالک، احناف، شوافع اور حنابلہ پر بھی فن حدیث کے خدام کی حیثیت سے اہل حدیث کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ خدام حدیث میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو مذاہب اربعہ میں سے کسی خاص مذہب کے ساتھ وابستہ نہیں رہے بلکہ وہ اہل حدیث کے مستقل مکتبہ فکر میں شمار ہوتے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے سب سے بڑھ کر حدیث کی خدمت کا فرض نبھایا ہے یہی باعث ہے کہ وہ بیک وقت فن حدیث کے خادم ہونے کے علاوہ اس مکتبِ فکر کے ترجمان بھی ہیں یا وہ اہل حدیث مکتبِ فکر کے بانی ہونے کے ساتھ ساتھ فن حدیث کے خدام بھی ہیں بلکہ ابتدائی اہل حدیث اصلا خدام حدیث ہی ہیں۔

مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ بیان کرتے ہیں:

"ابتدائی صدیوں میں اس مکتب فکر کے تمام بزرگ فن حدیث کے خادم تھے اس لیے ان میں خدمت مکتب فکر اور خدمت فن حدیث بیک وقت جمع ہوئے اور عموماً جمع ہی رہے لہٰذا دونوں کے لحاظ سے یہ عنوان ان حضرات پر منطبق ہو گیا، اس سے بعض ظاہری حضرات کو یہ مغالطہ ہوا کہ یہ عنوان صرف

1 مقالات حدیث، ۵۲۶، ام القری پبلیکیشنز، گوجرانوالہ، فروری ۲۰۰۹ء

خدمت فن سے مخصوص ہے حالانکہ یہ مکتب فکر بھی ہے۔"[1]

دوسرے قرن سے لے کر تیسرے قرن تک کے عہد اختلاف میں ایک جانب عقائد و اصول کے کلامی مباحث کا بازار گرم تھا اور دوسری جانب فقہ و فروع کے میدان میں مذہبی تعصب نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ فلسفی استدلال اور مذہبی جمود کے اس معرکہ آراء دور میں نقلی علوم پر قانع رہنا اور حدیث کو بلا تعصب بالادستی دینا اہل حدیث ہی کا طرہ امتیاز ہے۔

ڈاکٹر عبد الرشید اظہرؒ فرماتے ہیں:

"ان معرکوں کے دور کے بعد اہل حدیث یا محدثین کا لقب ہر حدیث پڑھنے یا پڑھانے یا اس کی شرح لکھنے والے کے لیے نہیں رہا ہے بلکہ کتاب و سنت کے ساتھ مخلصانہ تعلق، ان کی غیر مشروط بالادستی اور سلف صالحین کا صحیح عقیدہ اہل حدیث کا امتیازی وصف قرار پایا ہے اور ایسے مخلص لوگ ہی اس لقب سے ملقب قرار پائے ہیں۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ کتنے ہی شیوخ الحدیث کہلوانے والے اور حدیث کے معروف شارحین اہل حدیث کہلانے کو اپنے لیے باعث عار سمجھتے ہیں۔"[2]

جو حضرات اہل حدیث کو محدث ہی کے مترادف سمجھتے ہیں اور محدثین کو فقہ و فراست یا فہم و ادراک سے عاری باور کراتے ہیں، ان کا نکتہ نگاہ درست نہیں ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ اہل حدیث ایک مکتبِ فکر کا نام ہے جس کے خواص کا مشغلہ حدیث کے حفظ و اداء اور نقل و سماع کے ساتھ ساتھ حدیث کا فہم و تدبر اور اس پر عمل و اتباع بھی تھا چنانچہ اہل حدیث کو خاص محدث ہی باور کرانا اور فہم و تدبر یا فکر و دانش کو محدث کے اوصاف سے خارج قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے رقم کیا ہے:

"ہمارے نزدیک اہل حدیث سے صرف وہ لوگ مراد نہیں جنہوں نے حدیث کو سنا، لکھا اور روایت کیا بلکہ ان سے ہماری مراد وہ شخص ہے جو اس کے حفظ، فہم اور معرفت کا ظاہر و باطنی لحاظ سے مستحق ہے اور ظاہری و باطنی لحاظ سے اس کی اتباع کرتا ہے۔"[3]

---

۱ مقالات حدیث، ۵۲۸

۲ مقالات تربیت، ۴۶، دار التربية للنشر والتاليف، فيصل آباد، نومبر ۲۰۰۹ء

۳ مجموع الفتاوى ابن تيميه، ۹۵/٤، دار العربيه، للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت، لبنان

جن حضرات نے اہل حدیث کو محدث قرار دیا ہے، انہوں نے محدث کے اوصاف سے فکر و دانش ہی کو خارج نہیں کیا بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ عوام اس کے اطلاق سے خارج ہو جائیں گے حالانکہ محدثین کی روایات پر عمل کرنے والا عوامی گروہ ان کے عہد سے آج تک برابر موجود رہا ہے اور ظاہر بات ہے کہ وہ سب کے سب معروف معانی میں محدث نہ ہیں بلکہ وسیع مفہوم کے لحاظ سے اہل حدیث ہیں گویا اہل حدیث فکر کی رو سے اہل حدیث کے مفہوم میں محدثین کرام کے ساتھ ساتھ اہل حدیث عوام بھی شامل ہیں۔

مولانا زبیر علی زئیؒ رقم طراز ہیں:

"اہل حدیث ان صحیح العقیدہ محدثین و عوام کا لقب ہے جو بغیر تقلید کے کتاب و سنت پر فہم سلف صالحین کی روشنی میں عمل کرتے ہیں اور ان کے عقائد بھی کتاب و سنت اور اجماع کے بالکل مطابق ہیں۔ صرف دو گروہ ہیں حدیث بیان کرنے والے محدثین اور حدیث پر عمل کرنے والے محدثین اور ان کے عوام..."[1]

اہل حدیث کو محدث ہی قرار دینا اور محدث کو محض حدیث جمع کرنے والا فرد ہی سمجھنا اور حدیث پر عمل کو خارج کر دینا اہل حدیث کے خیال میں درست نہیں ہے چنانچہ جس طرح امام مالکؒ کے اقوال جمع کرنے والا مالکی، امام ابو حنیفہؒ کے فرمودات جمع کرنے والا حنفی، امام شافعیؒ کے فرامین مدون کرنے والا شافعی اور امام احمد بن حنبلؒ کے اقوال مرتب کرنے والا حنبلی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ اقوال امام پر وہ عمل پیرا بھی ہوتا ہے اسی طرح اہل حدیث سے مراد رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال کا جامع ہی مراد نہیں ہو گا بلکہ وہ احادیث و سنن پر عمل بھی کرے گا۔

مولانا محمد یحییٰ گوندلویؒ رقم فرماہیں:

"ہم اس سلسلہ میں عرض کرتے ہیں کہ کیا حنفی کا معنی یہ ہے کہ جو حنفی ائمہ کے اقوال کو تحریر تو کرے مگر اس پر عمل پیرا نہ ہو؟ کیا اصطلاح میں اسے حنفی کہا جائے گا؟ نہیں، بلکہ حنفی اس کو کہیں گے جو حنفی اقوال پر عمل کرتا ہو۔ اسی طرح اہل حدیث سے مراد بھی وہ لوگ ہیں جو کتاب و سنت پر

---

1 تحقیقی، اصلاحی اور علمی مقالات، ۲/۱۷

عمل کرتے ہیں۔"[1]

اہل حدیث اور شوافع

اہل رائے اور اہل حدیث کے الفاظ ایک دوسرے کی ضد میں استعمال ہوئے ہیں۔ اہل سنت کے فقہی مکاتب فکر میں سے احناف کو عموماً اہل رائے قرار دیا جاتا ہے جبکہ موالک، شوافع اور حنابلہ کے مکاتب فکر اہل حدیث میں سے شمار ہوتے ہیں۔ اہل حدیث فکر کی رو سے موالک، شوافع اور حنابلہ کو مطلقاً اہل حدیث سمجھنا درست نہیں ہے کیونکہ وہ مستقل طور پر الگ الگ مکاتبِ فکر ہیں۔ مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ نے رقم فرماتے ہیں:

"شوافع، موالک اور حنابلہ کو علی الاطلاق اہل حدیث سمجھنا بالکل سطحی نظریہ ہے جو جامد تقلید کے شیوع اور عروج کے بعد وضع کیا گیا ورنہ اہل حدیث یا اصحاب حدیث ایک ایسا مکتب فکر ہے جس نے تدوین سنت کے علاوہ دین کے ہر محاذ پر اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا کیے ہیں۔"[2]

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے اہل حدیث ایک مستقل مکتبِ فکر ہیں اور انہیں موالک یا شوافع یا حنابلہ سے مطلقاً نسبت دینا درست نہیں ہے۔ احکام و مسائل کے باب میں اہل حدیث کا نکتہ نگاہ عموماً شوافع یا حنابلہ کے مترادف یا ان کے قریب تر ہوتا ہے جس سے بعض حضرات کو مغالطہ ہوا کہ شوافع ہی کا دوسرا نام اہل حدیث ہے اور اہل حدیث کوئی مستقل مکتبِ فکر نہیں ہے حالانکہ کتب فقہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد مسائل میں شوافع کے ساتھ ساتھ اہل حدیث کا موقف الگ سے بیان ہوا ہے جس کی چند امثلہ درج ذیل ہیں:

ا۔ سوال یہ ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے پر وضو کرنا ہو گا یا نہیں؟ امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا اور دوبارہ وضو نہیں کیا جائے گا۔ جمہور علماء کرام کے بر خلاف ایک گروہ کا موقف یہ ہے کہ اونٹ کے گوشت سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اہل حدیث بھی اس کے قائل ہیں۔

امام نووی فرماتے ہیں:

« وذهب الى انتقاض وضوء به احمد بن حنبل و اسحاق بن راهويه و يحى بن يحى و ابو بكر بن المنذر وابن خزيمة واختاره الحافظ ابو بكر البيهقي وحكى

---

١ عقیدہ اہل حدیث، ۵۷

۲ مقالات حدیث، ۵۳۰

عن اصحاب الحدیث مطلقا »[1]

"احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، یحیی بن یحیی، ابو بکر بن منذر اور ابن خزیمہ کے نزدیک اونٹ کے گوشت سے وضو ٹوٹ جاتا ہے حافظ ابو بکر بیہقی نے بھی اسے اختیار کیا ہے۔ اہل حدیث کا مطلقا یہی موقف نقل کیا گیا ہے۔"

۲۔ تیمم کے باب میں ایک سوال یہ ہے کہ کتنے ہاتھ پر مسح کیا جائے گا؟ جمہور علماء کے نزدیک تیمم میں کہنیوں تک مسح کرنا لازم ہے۔ اس کے برخلاف اہل حدیث کا موقف یہ ہے کہ کف تک کا مسح کیا جائے گا بس!

علامہ ابن رشدؒ رقم کرتے ہیں:

« والقول الثانی، ان الفرض هو مسح الکف فقط وبه قال اهل الظاهر و اهل الحدیث »[2]

"دوسرا قول یہ ہے کہ صرف ہتھیلی کا مسح فرض ہے۔ یہ اہل ظاہر اور اہل حدیث کا موقف ہے۔"

مذکورہ امثلہ اہل حدیث کے اس دعوی کا بین ثبوت ہیں کہ اہل حدیث کا مکتبِ فکر شوافع سے الگ ہے وگرنہ انہیں الگ سے بیان نہ کیا جاتا۔ حنابلہ سے اہل حدیث کے تعلق کا بھی یہی حال ہے کہ اہل حدیث اکثر مسائل میں حنابلہ کے قریب تر ہونے کے باوجود متعدد مسائل میں ان سے الگ ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل حدیث کا مکتبِ فکر کبھی جمود و تعصب کا شکار نہیں ہوا۔ اہل حدیث اگرچہ تمام مکاتب فکر سے وابستہ بھی رہے ہیں تاہم ان میں مدغم نہیں ہوئے بلکہ اپنا تشخص برقرار رکھا ہے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ رقم طراز ہیں:

"اہل حدیث حضرات پر چونکہ فقہی جمود کا وقت کبھی نہیں آیا، خدمت فن اور حریت فکر ان میں عموما جمع رہی اور فقہی مسائل میں ان کا تعلق تمام مشہور مکاتب فکر سے برابر رہا ہے۔ یہ حضرات سب کے ساتھ ہونے کے باوجود کبھی کسی کے دامن سے وابستہ نہیں رہے۔ ایسے لوگوں کا صحیح عنوان اہل حدیث یا اصحاب الحدیث ہی ہو سکتا ہے جس کا تذکرہ قریبا دوسری صدی کے ابتداء ہی سے شروع

---

۱ شرح مسلم، ٤؍٤٩

۲ بدایة المجتهد ونهایة المقتصد، ۱؍٥٠، دارالتوفیق للطباعة جامعة الازهر، مصر، ١٤٠٣ھ۔

ہو گیا۔ رجال کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاً یہی مکتب فکر تھا۔"[1]

اہل حدیث مکتبِ فکر

امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ وغیرہم کے عہد سے لے کر آج تک ان کے اصحاب کے ساتھ ساتھ اہل علم کا ایک ایسا گروہ بھی موجود رہا ہے، جو اپنی الگ اور مستقل فقہی آراء اور کلامی نظریات رکھتا تھا۔ وہ کسی اہل علم کی تقلید نہیں کرتا تھا بلکہ قرآن وسنت کی واضح نصوص پر عمل کرتا تھا۔ اس زمانے سے لے کر آج تک اہل علم نے اس گروہ کو کبھی اہل الحدیث، کبھی اصحاب الحدیث، کبھی فقہاء الحدیث، کبھی فقہاء اہل الحدیث، کبھی فقہاء المحدثین، کبھی فقہاء اہل الاثر اور کبھی صرف محدثین کے نام سے موسوم کیا ہے اور ان کی فقہی آراء کو ایک مستقل مذہب کے طور پر بیان کیا ہے۔ مفتی رشید احمد لدھیانویؒ رقم فرماتے ہیں:

"تقریباً دوسری تیسری صدی ہجری میں اہل حق کے فروعی اور جزوی مسائل حل کرنے میں اختلاف انظار کے پیش نظر پانچ مکاتب فکر قائم ہو گئے یعنی مذاہب اربعہ اور اہل حدیث۔ اس زمانے سے لے کر آج تک انہی پانچ طریقوں میں حق کو منحصر سمجھا جاتا ہے۔"[2]

مذکورہ اقتباس میں حضرت لدھیانویؒ نے جس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے، وہ اپنی جگہ پر بالکل بجا ہے چنانچہ اہل حدیث کو فن حدیث کی خدمت تک ہی محدود رکھنا اور اسے ایک مستقل مکتبِ فکر نہ سمجھنا مقالہ نگار کے خیال میں درست نہیں ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ امام شہرستانیؒ نے اہل رائے اور اہل حدیث کے اختلاف کو اجتہاد کا اور علامہ ابن خلدونؒ نے فقہ کا باب بتایا ہے چنانچہ اہل حدیث کو خادم فن حدیث ہی سمجھنا اور فقہ و اجتہاد سے عاری قرار دینا اپنے خانہ ساز فلسفہ کی بنا پر تاریخ جھٹلانے کے مترادف ہے۔

چنانچہ مولانا محمد حسین بٹالویؒ رقم طراز ہیں:

"جس مسئلہ اعتقادیہ میں صریح سنت نبوی کا علم نہ ہو اس مسئلے میں اہل حدیث کا متمسک آثار سلفیہ ہوتے ہیں اور وہی مذہب اہل حدیث کہلاتا ہے جس کو متون اور شروح کتب حدیث و فقہ میں اہل حدیث سے منسوب کیا گیا ہے۔"[3]

---

١ مقالات حدیث، ۵۲۸

۲ احسن الفتاوی، ۱/۳۱۶

۳ تاریخ اہل حدیث از ڈاکٹر بہاؤ الدین: ۱/۲۰۵

دعائے قنوت قبل از رکوع ہے یا بعد از رکوع؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اہل حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:

« واما القنوت فالناس فيه طرفان و وسط، منهم من لا يرى القنوت الا قبل الركوع ومنهم من لا يراه الا بعده، واما فقهاء اهل الحديث كأحمد وغيره فيجوزون كلا الامرين لمجيء السنة الصحيحة بهما »[1]

”قنوت کے باب میں فقہا کی دو انتہائی اور درمیانی آراء ہیں: بعض کے خیال میں قنوت رکوع سے قبل اور بعض کے نزدیک رکوع کے بعد ہے مگر فقہائے اہل حدیث مثلاً امام احمدؒ وغیرہ دونوں ہی کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے متعلق صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں۔“

حق مہر کی کم سے کم مقدار کیا ہے؟ اس حوالے سے حافظ ابن حجرؒ نے اہل حدیث کا مذہب رقم فرمایا ہے:

« وأجازه الكافة بما تراضى عليه الزوجان أو من العقد إليه بما فيه منفعة كالسوط والنعل إن كانت قيمته أقل من درهم وبه قال... ابن أبي ليلى وغيرهما من العراقيين غير أبي حنيفة ومن تبعه والشافعي وداود وفقهاء أصحاب الحديث وبن وهب من المالكية»[2]

”مذکورہ تمام فقہاء نے کسی منفعت بخش چیز مثلاً جوتے یا تسمے کا حق مہر بننا بھی جائز قرار دیا ہے جس پر زوجین یا منکوحہ کا سرپرست راضی ہو جائیں۔ ابن ابی لیلیٰ، شافعی، داؤد، فقہائے اہل حدیث اور مالکیہ میں سے ابن وہب کا یہی موقف ہے۔“

قنوت نازلہ کا مشروع ہونا اہل حدیث کے نزدیک مسلم ہے، جس کی بابت شرح ہدایہ میں لکھا ہے:

«وبه قال جماعة من اہل الحديث»[3]

صفات الٰہیہ کے باب میں اہل حدیث کا مذہب بیان کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

« واستطال هؤلاء الخائضون على معشر اهل الحديث وسموهم مجسمة ومشبهة »[1]

---

۱ مجموع الفتاوى، ۲۳، ۱۰۰

۲ فتح البارى، ۹، ۲۰۹

۳ كمال الدين سيواسى، شرح فتح القدير، ۱، ٤٣٤

قلتین کے باب میں امام ابن حزمؒ نے اہل حدیث کا مذہب بیان کرکے فرمایا ہے:

« ویه قال اسحاق و ابو عبیدة وجماعة من اهل الحدیث منهم ابن خزیمة» [2]

علامہ ابن عابدین حنفی نے اہل حدیث کے ساتھ نکاح کے جواز یا عدم جواز کے متعلق ایک واقعہ کی بابت ذکر کرتے ہیں:

«ان رجلا من اصحاب ابی حنیفة خطب الی رجل من اصحاب الحدیث » [3]

"بلاشبہ ایک حنفی شخص نے ایک اہل حدیث کے گھر نکاح کا پیغام بھیجا۔"

نماز مغرب سے قبل دو رکعت نفل کے متعلق امام ابن حجر عسقلانیؒ نے اہل حدیث کا مذہب رقم کیا ہے:

« والی استحبابها ذهب احمد و اسحاق و اصحاب الحدیث »

خبر واحد کے متعلق اہل حدیث کا موقف بیان کرتے ہوئے حاشیہ نور الانوار میں رقم ہے:

« و هذا هو مذهب بعض اهل الحدیث» [4]

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اہل حدیث کو اہل ظاہر سے الگ کرکے بیان فرمایا ہے:

« فهذه طریقة المحققین من فقهاء المحدثین و قلیل ماهم وهم غیر الظاهریة من اهل الحدیث الذین لا یقولون بالقیاس والاجماع » [5]

"فقہائے محدثین میں سے محققین کا طریقہ یہی ہے اگرچہ وہ قلیل ہیں اہل حدیث اہل ظاہر کے علاوہ ہیں۔ اہل ظاہر اجماع وقیاس کے قائل نہ ہیں۔"

مذکورہ امثلہ سے واضح ہوتا ہے کہ اہل علم نے مذاہب اربعہ کے بانی ائمہ کرام اور دیگر فقہاء کرام کے ساتھ ساتھ ایک اور طبقے کا بھی ذکر کیا ہے، جسے انہوں نے فقہائے حدیث کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان کا اپنا ایک

---

۱ حجة الله البالغة، ۱/۶٤

۲ المحلی، ادارة الطباعة المنیریه، دمشق، طبع اول ۱۳٤۹ھ

۳ ردالمحتار شرح الدر المختار: ۳/۲۹۳

۴ نور الانوار مع شرح قمر الاقمار

۵ عقد الجید في أحکام الاجتهاد والتقلید :۷۱

مکتبِ فکر تھا اور وہ کسی امام خاص کے مقلد نہ تھے وگرنہ ان کی آراء کو الگ ذکر کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی، گویا ابتدائی زمانہ ہی سے اہل حدیث کا مکتبِ فکر بھی موجود رہا ہے اور متاخرین اہل حدیث نے بھی اپنے مذہب کو انہی کے موقف سے مستند قرار دیا ہے۔

ضمیمہ

اہل حدیث اور سلفی مکتب فکر کے امتیازات

مکتب اہل حدیث 'شریعت محمدیہ' کا ایک نمائندہ 'مدرسہ فکر' ہے، جو دورِ تقلید سے قبل خیر القرون میں مشہور تابعی حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ کی قیادت میں نمایاں رہا جس کے مقابل مشہور محدث اور فقیہ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ اہل الرائے سے معروف ہوئے۔ اس وقت دونوں مکاتب فکر کے ترجمان اہل علم تھے۔ برصغیر پاک وہند میں اکبر کے دینِ الٰہی کے خلاف مجدّد الف ثانی (شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ) نے جو علم توحید بلند کیا تو اس میں 'شریعت' کو 'تصوف' پر حاکم بتایا گیا۔ بعد ازاں شاہ ولی اللہ دھلوی رحمہ اللہ تقلیدی جمود کے خلاف کتاب وسنت کی حدود میں اجتہادی وسعتوں کو نکھارتے رہے، جو ان کے اولاد میں شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ اور شاہ محمد اسحاق دھلوی رحمہ اللہ کی اجتہادی رجہادی مساعی کے علاوہ غزوِ فکری کی صورت میں پھیلتا رہا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ظاہری ناکامی پر علمائے صادق پور وغیرہ پر سخت سامراجی تشدد کے سبب قتال نے غزوِ فکری کی صورت اختیار کرلی۔ سیاسی تحریکوں کے دوران تحریک آزادیٔ فکر بھی عوام کے ذہنوں میں پروان چڑھتی رہی جو مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ اور مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کی سرپرستی میں عوامی تحریک کا رنگ اختیار کر گئی۔ اس کا نام "تحریک اہل حدیث" رکھ دیا گیا۔ اب مکتب اہل حدیث اور تحریک اہل حدیث اسی کے دو رُخ ہیں۔ مکتب اہل حدیث خلیجی ممالک بالخصوص سعودی عرب کی وہابی تحریک سے ہم آہنگ ہو کر 'سلفی' لقب کو پسند کرتا ہے جبکہ عوامی تحریک اہل حدیث ایک پائیدار گروپ ہے۔ جس کا مستقبل کیا ہو؟ لمحہ فکریہ ہے! یہ مسئلہ علماء کے غور وفکر کا متقاضی ہے کہ تحریک اہل حدیث صرف تقلیدی جمود کے خلاف ہے یا چند فروعی مسائل کے علاوہ کوئی ٹھوس اصولی بنیادیں بھی رکھتی ہے جس پر 'تحریک اہل حدیث' کا مستقبل استوار ہونا چاہیے۔ (محدث)

www.kitabosunnat.com magazine.mohaddis.com

CPL No. 49
Vol. 53 No. 1
Monthly MUHADDIS Lahore
35866476
35866396

عناد اور تعصب قوم کے لیے زہرِ ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں

لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر اِفہام وتفہیم اُمت کے لیے رحمت کا باعث ہے۔

علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور افکارِ انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں

لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے

لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیتِ دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام میں حکمتِ عملی کو نظرانداز کر دینا مصالحِ دینیہ کے خلاف ہے

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین ومسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

آئین وسیاست سے بیگانہ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

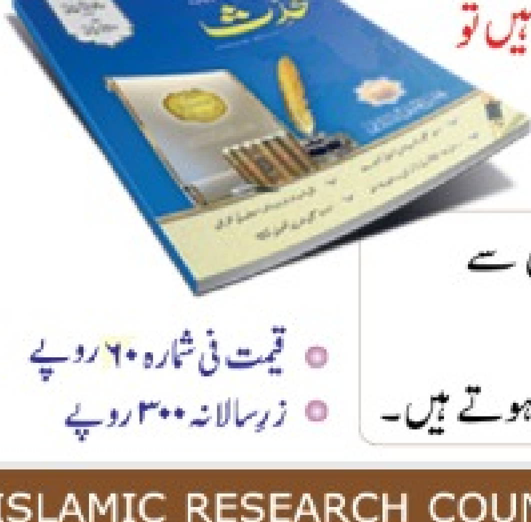

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمایئے، آپ اس کو ان جملہ صفات ومحاسن سے مزین پائیں گے، اِن شاء اللہ!
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

- قیمت فی شمارہ ۶۰ روپے
- زرِ سالانہ ۳۰۰ روپے

Designing: AK 0321-4966404